

دل نہ پانی

عمیرہ احمد

قسط نمبر (1)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

دانہ پانی

قسط نمبر 01

عمیرہ احمد

الف اللہ چنے دی بوٹی من وچ مرشد لائی ہو

نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگ ہر جائی ہو

(الف سے اللہ کا نام شروع ہوتا ہے، میرے مرشد نے میرے دل میں چنبیلی (اللہ کی محبت) کی قلم لگائی ہے میں نے اس پودے کی نفی اثبات کے پانی سے آبیاری کی (نفی: لا الہ، اثبات: الا اللہ) اور اس کی خوشبو کو اپنے ہر رگ وریشے میں بسالیا۔)

گامو ماشکی کی بلند آواز ہر روز کی طرح اُس صبح بھی جھوک جیون کی فضاؤں میں دور تک کونل کی کوک کی طرح گونج رہی تھی۔ وہ حق باہو کا کلام پڑھنا شروع ہوا تھا۔ ہر روز کی طرح فجر کے بعد گاؤں کے کنویں پر چرخی کے ساتھ اپنی مشک باندھ کر کنویں میں پھینکتے ہوئے گامو بڑے جذب سے وہ کلام شروع کر دیتا تھا۔

پیر ملے تے پیڑ نہ جاوے، اوہ پیر کیہہ کرتا ہو

جس مرشد تھیں رُشد نہ ہووے، اوہ مرشد کیہہ کرنا ہو

(پیر ملے اور درد نے جائے ایسے پیر کو مت مانو)

جس مرشد سے رُشد نہ ملے، اس مرشد کو کیا کرنا)

کنویں کی چرخی گر گر کر کے گھومتی جا رہی تھی اور اُس پر لیٹی رسی مشک کے وزن سے کھلتی جا رہی تھی اور گامو چرخی کو اور تیزی سے گھماتا حضرت سلطان باہو کا کلام بڑے جذب سے پڑھتا ہوا کسی اور جہاں پہنچا ہوا تھا۔ نہ اُسے قرآن آتا تھا نہ حدیث بس آتا تھا تو حق باہو کا کلام جو اُس نے اپنے باپ کو سن کر کرٹا تھا۔ بچپن میں کبھی ماں باپ نے قرآنی قاعدہ پڑھایا تھا اور پہلے سپارے سے پہلے ہی باپ کی موت نے غلام محمد کے ہاتھ میں سپارے کی جگہ پانی کی مشک پکڑادی جو اُس کے قد سے بھی بڑی تھی۔ اور وہ غلام محمد سے گامو ماشکی ہو گیا اور یہ کام اُس نے بڑی خوشی خوشی اپنے سر لیا تھا۔ وہ جدی پشتی ماشکی تھا..... باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے اور اُسے بھی باپ کے ساتھ بچپن سے ہی گاؤں کے کنویں پر جا کر

چرخی گھمانا اور مشک بھرنا اچھا لگتا تھا پر اُس سے بھی زیادہ مزے کا کام اُس پانی کی مشک سے پورے گاؤں کے گھروں کے مشکے اور برتن بھرنا تھا اور پھر گلیوں کی سوکھی مٹی پر پانی چھڑکنا اور سوکھی مٹی کا یوں نم ہو کر زمین پر بیٹھنا جیسے وہ اُس پانی کے لئے ہی ترسی ہوئی ہو۔ گاموتین سال کی عمر سے باپ کے ساتھ ساتھ صبح سویرے اپنے ننھے قدموں سے کسی بڑے کی طرح چلتے ہوئے جھوک جیون کے اُن پچاس، ساٹھ گھروں کے دروازے دروازے جاتا تھا۔ اُس کا باپ پانی چھڑکتا حق باہو پڑھتا جاتا اور وہ کلام ننھے غلام محمد کے ذہن میں جیسے نقش ہوتا گیا تھا۔ اُس کے باپ کی گُوک میں ہُوک نہیں تھی اور گاموکی آواز میں ہُوک ہی ہُوک تھی۔

جس ہادی تھیں نہیں ہدایت، اوہ ہادی کیہ کرنا ہو

مرشد عین حیاتی باہو، لوں لوں وچ سما یا ہو

(جس ہادی سے ہدایت نہ ملے، اس ہادی کے پیچھے چلنے سے کیا فائدہ؟)

مرشد تو وہ ہے جو عین حیات ہو، نس نس میں سما یا ہو)

مشک کنویں کی تہہ میں پانی سے ٹکرائی تھی اور چرخی گھومنا رُک گئی۔ ہلکے اندھیرے میں بھی گامو کو پتہ چل گیا تھا کہ مشک پانی سے ٹکرا گئی تھی اور اب پانی میں ڈوبتے ہوئے وہ اُس پانی کو اپنے اندر سمور ہی تھی۔ گامو کنویں کے کنارے کھڑا بغیر دیکھے بھی جیسے سب دیکھ رہا تھا۔ کتنی دیر میں مشک پانی تک پہنچتی کتنی دیر میں پانی سے بھر جاتی اور پھر کب واپس کھینچ لینی تھی۔ چرخی کے گرد لپٹی باقی ماندہ رسی یک دم کھل کر تن گئی تھی۔ گامو کو پتہ تھا اب اُسے مشک واپس کھینچ لینی تھی۔

کیستی جان حوالے رب دے، ایسا عشق کما یا ہو

مرن تھیں پہلے مر گئے باہو، تاں مطلب نوں پایا ہو

(ہم نے ایسا عشق کما یا ہے کہ اپنی جان صرف رب کے حوالے کر دی ہے)

مرنے سے پہلے ہی جان جان آفریں کے سپرد کر دی ہے تب کہیں جا کر مراد پائی ہے)

پو پھٹ رہی تھی جب گامو مشک کھینچ رہا تھا اور چرخی اُسی گر گر رر کی آواز کے ساتھ اب اُلٹا گھومتے ہوئے رسی کو پلیٹ رہی تھی۔ جب تک مشک کنویں سے باہر آئی گاؤں کے چند آوارہ گئے ہر روز کی طرح پیاس سے ہانپتے کانپتے زبانیں لٹکائے کنویں کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ وہ گامو پر کبھی نہیں بھونکتے تھے کیونکہ صبح شام وہی تھا جو مشک کنویں سے نکال کر سب سے پہلے کنویں کے پاس بنے اک گڑھے میں اُن کے لئے پانی ڈالتا تھا۔ وہ کتے گامو سے بھی پہلے اُس گڑھے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ مشک سے چھلکتا ٹھنڈا پانی اُس گڑھے میں گرنے لگا اور تب تک گرتا ہی گیا جب تک آخری کتا بھی اپنی پیاس بجھا کر ہٹ

جاں دو مرشد کا سہہ دڑا، تاں وی بے پرواہی ہو
راتیں جاگیاں کیہ ہو یا جے، مرشد جاگ نہ لائی ہو

(جب سے مرشد نے میرے ہاتھ میں طلب حق کا کا سہہ دیا ہے، تب سے میں دنیا سے بے پرواہ ہو گیا ہوں
راتیں جاگنے سے کیا ہوگا، جب تک مرشد دل میں تڑپ نہ پیدا کرے گا)

جھوک جیون کی صبح اور شام گا مو ماشکی کے پانی اور حق باہو کے کلام سے ہوتی تھی۔ نہ مشک کا پانی
ختم ہوتا تھا نہ گامو کی آواز کا سوز..... نہ اُس کی ہوک..... جو بھی گامو کو سنتا تھا بس سنتا ہی رہ جاتا تھا۔ وہ
اس گاؤں کا pied piper تھا جو صبح سویرے پانی بھرتا چڑکا تا پیاس بجھاتا پورے گاؤں کے چرند پرند کو
اپنے پیچھے لگائے پھرتا رہتا تھا۔ گاؤں کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا جیسے گامو کی آواز، اس کے پیروں کی چاپ، اُس کی
مشک سے چھلکتے پانی کی مہک اور مٹھاس کو پہچانتا تھا۔ وہ کتے کنویں پر گامو کی مشک سے پانی پیتے پھر گامو
کے ساتھ ساتھ پورے گاؤں میں تب تک گھومتے پھرتے جب تک گامو مشک بھر بھر کر گاؤں کی گلیوں میں
پھرتا رہتا اور پھر جب وہ اپنے گھر چلا جاتا تو وہ بھی لوٹ جاتے اور پھر شام کو پھر کنویں پر گامو کے انتظار
میں بیٹھے ملتے۔

گامو رستے میں آنے والی ہر مخلوق کو پانی پلانے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور کئی بار گاؤں کی عورتوں کی
جھڑکیاں سنتا جن کے گھر وہ اس لئے دیر سے پہنچتا تھا کیونکہ اُس کی مشک بار بار بھر کے ختم ہو جاتی تھی۔ پر
گامو کے ماتھے پر کبھی بل آیا نہ اُس کے ہونٹوں سے کبھی ہنسی چھوٹی۔ چھوٹے قد کا دبلا پتلا معمولی صورت کا
سانو لاگامو پانی ڈھوڈھو کے اُس گاؤں کے لوگوں کا راز داں بن گیا تھا جس سے پانی بھرواتے پیتے کوئی
بھی کچھ بھی پوچھ لیتا..... کچھ بھی کہہ دیتا..... دل کے اندر کے رازوں سے لے کر ذہن کے پردوں پر بننے
والی یادوں تک..... گامو ماشکی سے کسی کا کوئی پردہ نہیں تھا..... دل سے کسی کا کیا پردہ۔ وہ جھوک جیون کی
رگوں میں پانی خون کی طرح پہنچاتا جھوک جیون کا دل ہی تو تھا۔

کنویں سے مشک اٹھاتا وہ سب سے پہلے گاؤں کے قبرستان میں قبریں تر کرنے جاتا تھا۔ یہ بھی
اُس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کی قبروں پر پانی چھڑکتے چھڑکتے گامو
ساری ہی قبروں کو تر کرنے لگتا تھا کیونکہ گیلی قبروں کے درمیان سوکھی قبریں یوں گامو کا منہ چڑاتی تھیں
جیسے اُس نے سب کو پانی پلا دیا ہو اور کسی کو چھوڑ دیا ہو اور گامو کہاں کسی کو چھوڑنے والا تھا۔ وہ جن کے
خاندان والوں کی قبریں تھیں وہ آئے نہ آئے گا موزور آتا۔ قبریں ٹھنڈی کرتا پورے قبرستان میں پانی
چھڑک کر چلا جاتا اور جہاں جہاں کسی نے قبر پر پرندوں کے لئے دانہ پانی کے پیالے رکھے ہوئے وہاں

بھی پانی بھر جاتا۔

وہ قبرستان کے بعد سیدھا گاؤں کی مسجد جاتا وہاں گھرے بھرتا اور خوشی سے نہال ہوتا رہتا یوں جیسے وہ رب سوہنے کے گھر میں پانی دینے آیا ہوتا۔ گاؤں کی اُس کچی پکی مسجد میں کوئی نمازی آتا نہ آتا گاؤں پانی ڈالنے ضرور آتا۔ قبرستان میں لگے موتیا کے پودوں سے موتیے کے پھول توڑ کر وہ مسجد کے پانی کے گھروں کے پاس چھوڑ جاتا۔ کسی اور نے مسجد میں جھاڑو نہ لگایا ہوتا تو وہ جھاڑو لگانے کھڑا ہو جاتا۔

اور مسجد کے بعد وہ سب سے پہلے گاؤں کے چوہدریوں کی حویلی جاتا تھا۔

بغداد شہر کی اے نشانی اچیاں لسیاں چیراں ہو
تن من میرا پرزے پرزے جیویں درزی دیاں لیراں ہو
(بغداد شہر کی کیا نشانی ہے؟ فقر کی راہ میں لگے گہرے زخم)

اس راہ میں میرا تن من یوں لیرو لیر ہو چکا ہے جیسے درزی کے کٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے)

اُس حویلی سے گامو کو دانے آتے تھے وہ دانے جس سے اُس کے گھر کا چولہا جلتا تھا اور اُس کے پیٹ کا ایندھن بھی۔ وہ احسان مندی اور تشکر کے لئے وہاں پانی ہی لاسکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ حویلی میں ہینڈ پمپ بھی لگا تھا اور وہاں پچھلے احاطے میں اپنا کنواں بھی تھا۔ اُسے کبھی کسی نے حویلی پانی لانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ پر گامو پھر بھی وہاں جاتا اور حویلی میں وہیں سے پانی لے لے کر اندر باہر چھڑکتا پھرتا اور حق باہو کا کلام پڑھتا جاتا۔ کئی بار چوہدری کرامت اُسے بٹھا کر وہ کلام سنانے کا کہہ دیتے اور جس دن وہ چوہدری کرامت کو کلام سناتا اُس دن صبح سویرے ہی جیسے اُس کا دامن دانوں سے بھر جاتا۔ وہ گامو کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی رخصت کرتے۔ گاؤں کے ماشکی کے لئے کبھی حویلی کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا یہ جیسے اُس کے کام اور عہدے کی تکریم تھی۔

لیراں دی گل کفنی پا کے، دل ساں سنگ فقیراں ہو
منگ بغداد دے ٹکڑے باہو، کرساں میراں میراں ہو

(دل و روح کے ان ٹکڑوں کا کفن پہن کر میں بغداد کے فقیروں میں مل جاؤں گا)

بغداد شہر کی گلیوں میں بھیک مانگتا پھروں گا اور محبوب کا نام بار بار پکاروں گا)

اندر کسی کمرے میں مردان خانے میں جانے کے لئے تیار ہوتے ہوئے چوہدری کرامت کے سینے پر گامو کے کلام نے جیسے سینے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ چوہدری اُن کو چار مہینے ہوئے تھے فوت ہوئے اور جب سے وہ گئی تھی چوہدری کرامت کا اندر باہر ہی بدل کے رہ گیا تھا۔ گامو کی آواز اُس کو اندر باہر سے یوں ”پھروں“ رہی تھی جیسے دانوں کو صاف کرنے کے لئے اُن میں ہاتھ پھیرتی کسی کی انگلیاں۔

چوہدری کرامت نے شیشے کے سامنے کھڑے اپنی آنکھوں کو رگڑ کر خشک کیا تھا اور پھر کلا سر پر جماتے ہوئے اُس نے اپنے ملازم کو آواز دی تھی:

”گامو کو چھاپچھ کی گھڑولی دینا آج دانوں کے ساتھ۔“ اُس کا ملازم تابعداری سے باہر لپکا۔

چوہدری کرامت کی حویلی میں کئی دن سے سفیدی ہو رہی تھی۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کی شادی کی تیاری تھی جو چوہدرائیں کی زندگی میں شروع ہوئی تھی اور اب اُس کے جانے کے کئی مہینے بعد دوبارہ شروع ہوئی تھی۔

ایہہ تن میرا چشمہ ہووے، مرشد دیکھ نہ رجاں ہو
مرشد دادیدار ہے باہو، لکھ کروڑاں ججاں ہو
(میرا پورا جسم آنکھ بن جائے اور مرشد کو دیکھ میرا جی نہ بھرے
مرشد کا دیدار تو لاکھوں کروڑوں حج کے برابر ہے)

گامو کی بیوی اللہ وسائی نے برتن میں پڑے دانوں کی آخری مٹھی کو پتھر کی اُس چکی کے سوراخ میں ڈالا تھا جسے چلاتے ہوئے وہ اس وقت گھر کے صحن میں بیٹھی آٹا پیس رہی تھی۔ بس وہ آٹا آج اتنا ہی ہوتا کہ پیس کر دو وقت کی روٹی مل جاتی پھر کل کیا ہوتا وہ کبھی اللہ وسائی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ صبح اُٹھ کر ایک مٹھی بھر کر دانے اسی برتن سے گھر کے صحن میں آنے والے پرندوں کے لئے نکال دیتی اور کچھ مٹھی دانے آٹا پیسنے کے لئے۔ وہ برتن چھوٹا تھا اور اُس میں دانے چوہدریوں کے گھر سے ہی آتے تھے ہمیشہ۔ فصل کلنے کے وقت زیادہ آتے اور کئی مہینے چلتے اور جب وہ ختم ہونے لگتے تب بھی کسی نہ کسی خدمت کے عوض چوہدریوں کے گھر سے کچھ نہ کچھ آتا ہی رہتا۔ اللہ وسائی ہر بار آخری مٹھی نکالتے ہوئے سوچتی کہ اتنی بڑی دنیا کے لکھ کروڑوں لوگوں میں رب سوہنے کو گامو اور اُس کی بیوی کا وہ خالی ہوتا برتن بھی نظر آتا اور یاد ہوتا تھا۔

”واہ رب سوہنے تیری شانناں!“ وہ سوچتی اور ہر بار اُس برتن کے دوبارہ بھرنے پر رب سوہنے پر قربان جاتی..... اُس برتن کا خالی ہو کر دوبارہ بھر جانا اللہ وسائی کے لئے معجزہ تھا اُسے رب سوہنے کی ذات سے کوئی اور معجزہ نہیں چاہیے تھا۔

پتھر کے دو پاٹوں والی چکی کا ڈنڈا اللہ وسائی کے ہاتھوں میں گھومتا جا رہا تھا اور آٹا پیس پیس کر دو پاٹوں سے نکل نکل کر نیچے پھیلانے لگا پڑے پر گرتا جا رہا تھا۔

اللہ وسائی کا سانس پھولا تھا۔ وہ جیسے سانس لینے کے لئے رُکی۔ دوپٹے کے پلو سے اُس نے اپنے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔ مئی جون میں چکی چلاتے وہ سر سے پیروں تک اسی طرح پیسنے میں نچڑ جاتی تھی۔

دوبارہ چکی چلانا شروع کرنے سے پہلے اُس نے جیسے کان لگا کر فضا میں گامو کی آواز کی کسی بازگشت کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی آواز پورے گاؤں میں گونجتے گونجتے اُس کے اپنے گھر میں اللہ وسائی کے کانوں تک بھی ضرور پہنچتی تھی اور اُس کی آواز کی اونچ نیچ سے اللہ وسائی جیسے حساب لگالیتی تھی کہ وہ اس وقت گاؤں کی کس گلی میں تھا۔ اور کب تک گھر پہنچ جائے گا۔

وہ فجر کے وقت گامو کے گھر سے نکلتے ہوئے اُٹھتی تھی اور پھر گھر میں گامو کی قریب دور ہوتی آواز کی گونج سے وہ گھر کے کام نپٹاتی۔ اُس کی آواز جیسے اللہ وسائی کے لئے گھڑی کا کام دیتی تھی۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بڑا ہوتا تب بھی اللہ وسائی کو یقین تھا گامو کی آواز پھر بھی اتنی بلند ہوتی کہ اُس کے گھر تک ضرور پہنچتی رہتی۔

گامو گلیاں گلیاں پھر تا اللہ وسائی گھر کے کام نپٹا اُس کے آنے سے پہلے اُس کے لئے آٹا پیس کر ناشتہ تیار کئے بیٹھی ہوتی۔ گندم کی روٹی اور اچار، کبھی اچار اور رات کا بچا ہوا سالن اور کبھی خالی روٹی۔ گاموں کی کمائی پانی کی کمائی تھی اور پانی کی کمائی ہوائی رزق۔

پر اللہ وسائی کو کبھی فرق نہیں پڑا تھا کہ گامو کیا کماتا تھا اور کیا لاتا تھا اُس کے لئے بس گامو کافی تھا۔ باقی چیزیں ہوتیں نہ ہوتیں آتیں نہ آتیں۔ جتنا سیدھا گامو تھا ویسی ہی اللہ میاں کی گائے اللہ وسائی تھی۔ گاؤں کے ہر گھر میں ہر کام کے لئے آگے آگے۔ خوشی غمی میں بغیر بلائے جانے والی۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہوتی تو اللہ وسائی باورچی خانہ اور برتن سنبھال لیتی۔ داج سینے پر ونے میں تو وہ پہلے ہی آگے ہوتی تھی پر جب تک شادی چلتی رہتی اللہ وسائی راکھ سے برتن مانجھ مانجھ کر اپنے ہاتھ زخموں زخمی کر لیتی پھر بھی اُس کو درد نہیں ہوتا تھا۔ لڑکی رخصت ہوتی اللہ وسائی گاؤں کی آخری سڑک تک گھر والوں کے ساتھ روتی دھوتی جاتی۔ لڑکی کی ماں بہنوں کو تسلی دیتے دیتے خود رو رو کر ہلکان ہو جاتی اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ناک اور آنکھیں رگڑ رگڑ کر اپنا حشر کر لیتی اور اگر کہیں لڑکے کی شادی ہوتی تو اللہ وسائی ایسی ڈھولک بجاتی کہ پورا گاؤں ناچ اُٹھتا۔ اُس کے ہاتھ سرخ ہو جاتے، بازو اور کندھے دُکھنے لگتے بیٹھے بیٹھے ٹانگوں میں کھلیاں پڑنے لگتیں مگر مجال تھی کہ اللہ وسائی محفل چھوڑ کر جاتی۔ اُسے سارے سہرے، سارے پٹے یاد تھے۔ اپنی تتلائی زبان سے وہ سہرا شروع کرتی اور پورے گاؤں کی عورتیں اُس کی ہم آواز ہو کر گانے لگتیں اور اُن کے گانے اور آوازوں میں اللہ وسائی کی تتلائی آواز چھپ جاتی اور اللہ وسائی پھر بھی ڈھولک پیٹتے سہرا گاتی جاتی۔ ڈھولک کی طناپیں کستی بار بار نئے سرے سے نئی لے پر ڈھولک پیٹتی وہ گامو ماشکی کی بیوی نہ مشہور ہوتی تو پھر ڈھولک والی مشہور ہوتی۔

گاؤں میں کسی کے گھر سوگ ہو جاتا تو بھی اللہ وسائی سب سے پہلے پہنچنے والوں میں سے تھی اور شادی کے گھر کی طرح وہ سوگ والے گھر میں بھی باورچی خانہ سنبھال کر بیٹھ جاتی تھی۔ غم سے بے حال اہل خانہ کو اللہ وسائی کے ہوتے ہوئے یہ نہیں سوچنا پڑتا تھا کہ دوسرے گاؤں سے آنے والے شریکے کو کسی نے کھانا کھلا کر بھیجا یا نہیں اور کھانا آیا کہاں سے۔ اللہ وسائی اور گامو ماشکی جہاں سے بھی بندوبست کرتے سوگ والے گھر کا چولہا ٹھنڈا نہ پڑنے دیتے۔ اللہ وسائی ہر میت پر یوں بلک بلک کر روتی جیسے وہ اسی کا رشتہ دار تھا۔ حالانکہ اللہ وسائی نے کسی اپنے کی موت کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ اُس کے ماں باپ اُس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی طاعون کا شکار ہو کر مرے تھے۔ دادا، دادی، نانا، نانی پہلے ہی نہیں تھے۔ رشتے کے جس چچا نے اُسے پال کر شادی کی تھی۔ وہ ابھی بھی حیات تھے اور اُن کے اہل خانہ بھی مگر اللہ وسائی پھر بھی ہر موت پر اپنے رشتہ داروں کے نام لے لے کر یوں روتی تھی جیسے اُس کا غم تازہ ہو گیا تھا۔

گاؤں والے ہر خوشی غمی میں اللہ وسائی کو پکارتے پھرتے تھے لیکن اگر کبھی نہیں پکارتے تھے تو تب نہیں پکارتے تھے جب کسی کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا۔ پھر کسی کے گھر سے اللہ وسائی کے لئے نیوتا نہیں آتا تھا۔ وہ بے اولاد تھی نیک تھی تو کیا تھا، تھی تو بے اولاد اور بے اولاد عورت کی پرچھائیں بھی کسی کو اپنے گھر میں نہیں چاہیے تھی۔ وہ سب اللہ وسائی کو جانتے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ نہ حسد کرتی ہے نہ جلن رکھتی ہے پھر بھی لوگوں کو اندیشہ ہوتا کہ اُس کی نظر نہ لگ جائے۔ اللہ وسائی دس سال سے بے اولاد تھی اور اُس نے جیسے اس بے اولاد کو بھی اللہ کی رضا سمجھ کر سر جھکا دیا تھا پر دنیا کو اللہ کی رضا سے سروکار نہیں ہوتا نہ اللہ کے حکم سے۔ دنیا اپنے وہموں اور رواجوں پر چلتی ہے اور اللہ وسائی کو کسی سے اس بات پر بھی گلہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ خاموشی سے آس پڑوس میں بچے کی پیدائش پر آ کر قرض کرنے والے ہیچڑوں کی آوازیں اور گانے سنتی جو گڑوی بجابجا کرنا چتے دعائیں دیتے، نو مولود کی بلائیں لیتے اور اللہ وسائی اپنے گھر کے اندر چوکھٹ سے کان لگائے باہر کے اس شور و غل کو سن کر خوش ہوتی رہتی۔ اپنی تملائی زبان میں وہ بھی ہیچڑوں کے ساتھ آواز ملاتی نئے پیدا ہونے والے بچے کو بغیر دیکھے بغیر چھوئے لوریاں دیتی رہتی اور گامو اگر گھر پر ہوتا تو دل مسوس کر رہ جاتا صحن میں بیٹھے وہ حقہ پیتے کبھی اُس کو دیکھ کر ہنستا کبھی روتا اللہ وسائی کے قہقہوں میں اُس کی آنکھوں کی برسات دیکھتا جاتا اور پھر حق باہو کا کلام پڑھنے لگتا۔ وہ کلام جیسے اُس کے سارے زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔ وہ رب کی شان بیان کرتا جیسے رب کی محفل میں پہنچا ہوتا اور ہر بار اس کیفیت میں آنے کے بعد وہ جیسے توبہ توبہ کرتا۔ کہاں رب کہاں گامو ماشکی..... اُس کی کیا اوقات کہ

وہ رب سوہنے کے دربار میں ہونے کا بھی سوچے۔ وہ با آواز بلند اپنے آپ کو کوستا اور اللہ وسائی اُسے کسی مرید کی طرح دیکھتی جاتی۔ اللہ وسائی کو گامو کے اُس کلام کی کھکھ سمجھ نہیں آتی تھی جس کو سننے کے لئے لوگ رُک جاتے تھے۔ وہ بھی گامو کی طرح چٹی ان پڑھ تھی اور اُسے اگر کچھ یاد تھا تو شادی بیاہ کے سہرے اور پٹے اور بس۔ پر گامو کو حق باہو کا کلام پڑھتے سن کر اُس پر بھی جیسے وجد طاری ہو جاتا تھا اور وہ زار زار روتی تھی۔ وہ کلام کیا کہتا تھا یہ اُسے نہیں پتہ تھا مگر اُسے یہ پتہ تھا کہ وہ حق تھا۔ بزرگوں کی باتیں تھیں۔ نیکوں اور ولیوں کی اور اُس میں رب سوہنے کا نام آتا تھا۔ بار بار آتا تھا اور جب بھی گامو کلام پڑھتے ہوئے اللہ کا نام لیتا۔ دوپٹہ اوڑھے اللہ وسائی کچھ بھی کر رہی ہوتی وہ اپنی انگلیوں اور انگوٹھوں کو عقیدت سے چومتی پھر سینے پر ہاتھ لگاتی جیسے رب کو دل میں اُتار رہی ہو۔ اُس نے کبھی گامو کا کلام پڑھنے کی جرات نہیں کی تھی۔ وہ تلاتی تھی اور اُسے لگتا تھا وہ اُس کلام کو تلا کے پڑھے گی تو بے ادبی کرے گی اور یہ کوئی ٹپہ اور سہرا تو ہے نہیں کہ کچھ بھی کہہ دو کچھ بھی گا جاؤ معافی ہی معافی ہے۔ رب سوہنا تو پکڑ کرتا ہے اور اُسے رب سوہنے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ پیار بھی آتا تھا پر ڈر زیادہ لگتا تھا۔ گامو گھر میں جب بھی وہ کلام پڑھ رہا ہوتا اللہ وسائی اُسے بغیر مخاطب کئے بیٹھی سنتی رہتی اُسے گامو پر پہلے سے بھی زیادہ پیار آتا تھا اور اُسے یقین تھا گامو اللہ کو بھی بڑا پیارا تھا اور گامو اُس کی ایسی باتیں سن کر شرما کر ہنستا۔ اُس کا سانولا رنگ سرخ ہو جاتا اور وہ اللہ وسائی پر اور قربان جاتا وہ اُس کی زندگی کی ”ملکہ حسن“ تھی اور اُس کے چہرے پر وہ حسن صرف گامو کو ہی نظر آتا تھا جس کی زندگی کی دھوپ میں وہ چھاؤں کی طرح شامل ہوئی تھی۔ نہ گامو کو کبھی اُس کی تلا ہٹ بُری لگتی تھی نہ اُس کا چہرہ۔ وہ اللہ وسائی کو اللہ والی سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ جو کہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ اور اللہ وسائی اُس کی باتوں پر ہنستی تھی۔

”توبہ کریا کر گامو کس کو اللہ والی کہتا ہے۔“

وہ خود بھی کانوں کی لوؤں پکڑتی ناراض ہوتی اور اُسے بھی ڈانٹتی۔ وہ خود گامو کو مومن سمجھتی اور ہر دم درود اُس سے کرواتی یہ جاننے کے باوجود کہ گامو کو قرآن نہیں آتا اور وہ نماز میں بھی مسجد میں صرف بسم اللہ پڑھ پڑھ کر آ جاتا تھا۔ پر اللہ وسائی کو پھر بھی یقین تھا کہ گامو کی دعا میں بڑا اثر تھا۔

گاؤں والے ان دونوں کو ہیرا نہجھا کہتے تھے اور گامو اور اللہ وسائی کھل کھل ہنستے موربن کے اتراتے پھرتے۔

دور کہیں گامو کی آواز گونج رہی تھی۔ لفظ سمجھ نہیں آرہے تھے مگر اُس کی آواز کی گونج گامو کے گھر آنے سے پہلے اللہ وسائی تک پہنچ گئی تھی۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی آتا گوندھنے لگی۔ جب تک گامو گھر پہنچا

وہ آٹا گوندھ کر مٹی کا چولہا جلا چکی تھی اور اب لکڑیوں میں پھونکیں مار مار کر اُس آگ کو تیز کر رہی تھی تاکہ تو ا جلد گرم ہو جائے۔ لوہے کی پھونکتی لکڑیوں میں پھنسائے پھونکیں مار مار کر اللہ وسائی نے بالا آخر آگ تیز کر لی تھی جب گا مو گھر کے کھلے دروازے کا پٹ کھول کر اندر آیا تھا۔

”لے بھلی مانس آج تو چھا چھ آگئی چوہدری صاحب کے گھر سے۔“

گامو نے سلام دعا کے بعد تانبے کے برتن میں پڑی چھا چھ اُس کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنی مشک سے اپنے گھر کے پانی کے برتن بھر رہا تھا اور پھر وہ مٹی میں اٹے ہوئے اپنے ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور بال دھونے بیٹھ گیا تھا۔

اللہ وسائی نے پہلے گامو کے مونڈھے پر پڑے کپڑے میں بندھے دانے کھولے اور انہیں اُس خالی برتن میں ڈالتے ہوئے ہنسی جو آج خالی ہوا تھا اور آج ہی پھر بھر گیا تھا۔ پھر وہ چھا چھ کے برتن سے پیالوں میں چھا چھ اُنڈیلنے لگی تھی۔ گامو تب تک منہ، ہاتھ دھو کے آ گیا تھا۔

”سن گا مو پیر صاحب ملیں گے نا ہمیں۔“

اُس کے سامنے روٹی کی چنگیر رکھتی اللہ وسائی نے اُس سے پوچھا تھا۔

”کیوں نہیں ملیں گے چوہدری کرامت کے گھر آنے والی ہے اُن کی بیٹی بہو بن کر اور ہم اُن کی بیٹی کے ہونے والے سسرال سے ہوں گے۔ ہم سے کیوں نہیں ملیں گے۔“ گامو نے روٹی توڑنے سے پہلے چھا چھ کا گھونٹ لیتے ہوئے جیسے اکڑ کر کہا تھا۔

”لے توں اتنا سسرال والا۔“ اللہ وسائی ہنسی تھی گا مو کی اکڑ دیکھ کر۔

”پیر صاحب بڑے نیک ہیں بھلیے لوک..... کوئی گدی نہیں ہے اُن کی..... کہتے ہیں اُن کو دعا ہے کسی کی کہ فیض ملے گا لوگوں کو اُن سے۔“ گا مو روٹی توڑ توڑ کر کھاتے ہوئے جیسے اُسے بتا رہا تھا۔

”ہم جیسے پتہ نہیں کتنے آتے ہیں اُن کے پاس اور وہ ہر ایک سے ملتے ہیں۔ کسی کو ٹھکراتے نہیں..... نہ نہیں کرتے۔“ گا مو بڑا مرعوب بول رہا تھا۔

وہ آج برابر والے گاؤں میں پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جانے والے تھے۔ پتہ نہیں اولاد کے لئے انہوں نے کہاں کہاں سے دُعا کروائی تھی۔ مگر پیر ابراہیم کا انہوں نے کبھی پہلے کسی سے سنا ہی نہیں تھا اور اب جب سنا تھا تو گا مو حیران تھا کہ پہلے کیوں نہیں سنا۔

”سنا ہے اُن کی بیٹی ست بھرائی ہے اور بڑی سوہنی ہے۔“ اللہ وسائی نے گاؤں کی عورتوں سے سنی سنائی باتوں کو تصدیق جیسے گا مو سے کی تھی۔

”لے مجھے کیا پتہ کہ سوئی ہے یا نہیں مگر سست بھرائی ہے پھر پیر صاحب کی بیٹی ہے اُس کے خوش نصیب ہونے کو اتنا ہی کافی ہے۔“ گامو نے جواباً کہا تھا۔

”یہ تو تو نے ٹھیک کہا گامو۔“ اللہ وسائی نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”اور دیکھ تو پنڈ کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر چوہدریوں کے گھر کی عورتوں کی باتیں نہ کیا کر ہم رزق کھاتے ہیں اُن کا..... ہم باتیں کرتے اچھے نہیں لگتے اُن کے بارے میں۔“ گامو نے جیسے بڑی سنجیدگی سے بیوی کو سمجھایا تھا۔

”میں باتیں نہیں کرتی گامو۔ عورتیں کرتی ہیں۔ میں تو بس سنتی ہوں۔“ اللہ وسائی نے جیسے اپنی صفائی دی۔ ”تو سنا بھی نہ کر..... اُٹھ جایا کر۔“ گامو نے کہا۔ اللہ وسائی نے چھاپچھاپا لہ منہ سے لگالیا۔

☆.....☆.....☆

پیر ابراہیم کا ڈیرہ کئی دہائیوں سے دُعا کے لئے آنے والے لوگوں سے بھر رہا تھا۔ وہ نہ روایتی پیر تھے نہ کوئی گدی نشین نہ ہی وہ تعویذ دھاگے کرتے تھے پھر بھی لوگ اُن کے پاس آ کر بیٹھتے تھے مسئلے بتاتے تھے دُعا کرواتے تھے۔ لوگ کہتے تھے اُنہیں اُن کے بچپن میں کسی بزرگ کی دُعا لگی تھی اور جیسے اُن کا ہاتھ فیض والا ہاتھ ہو گیا تھا۔ پیر ابراہیم کو اس کا احساس بڑے ہو کر ہوا تھا کہ فیض بانٹنے والے پر کیسا بھاری بوجھ ہوتا ہے۔

وہ جدی پشتی زمیندار تھے اور اُن کی شادی سید نہ ہونے کے باوجود سیدوں میں ہوئی تھی۔ وہ خود جتنی عبادت کرنے والے انسان تھے اُنہیں بیوی بھی ویسی ہی عبادت کرنے والی ملی تھی۔ کہتے ہیں جوانی کی عبادت اللہ کو بہت پیاری ہوتی ہے اور وہ دونوں میاں بیوی جوانی میں عبادت کرنے والے تھے اور پیر ابراہیم کو یقین تھا اُن سے ملنے والا فیض تب ہی جاری رہ سکتا تھا جب وہ خود سیدھے رستے پر رہتے..... جس دن وہ اللہ کی حدیں توڑتے وہ ڈیرہ ختم ہو جاتا۔

گامو اور اُس کی بیوی ناشتہ کر کے اُس دن صبح سویرے نکلے تھے پر جب تک وہ دوسرے گاؤں میں پیر ابراہیم کے ڈیرے پر پہنچے تو سہ پہر ہو چکی تھی اور اُنہیں وہ ڈیرہ خالی ملا تھا۔

”پیر صاحب سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔“ گامو نے ایک آدمی سے کہا جو ڈیرے کے باہر صحن میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔

”پیر صاحب تو اُٹھ گئے۔ جلدی آنا تھا۔“ اُس ملازم نے جواباً اُسے کہا تھا۔ گامو کچھ مایوس ہوا۔

”اٹھ گئے؟..... ہم تو دس میل چل کر آئے ہیں دوسرے گاؤں سے۔“ وہ ملازم ہنس پڑا تھا۔

”یہاں تو لوگ بیس بیس میل چل کر بھی آتے ہیں۔ اگلے ہفتے آ جانا۔ وہ روز روز تو بیٹھتے بھی نہیں کہ میں تمہیں کہوں رات رُک جاؤ اور کل مل کے چلے جانا۔“ ملازم نے جیسے بڑی لاپرواہی سے اُن سے کہا تھا۔ گا مو اور اللہ وسائی بڑی مایوسی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

”بڑی مصیبت میں ہیں ہم بھائی..... کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟“ اللہ وسائی نے اُس ملازم کی منت کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں سارے مصیبتوں والے ہی آتے ہیں۔ کوئی تم اکیلے تھوڑی ہو ضرورت مند۔“ وہ ملازم کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ گا مو کندھے پر ڈالی ہوئی مشک سے اُس برتن میں پانی ڈالنے لگا۔ جو کبوتروں کے لئے رکھا تھا۔ اللہ وسائی کے برعکس وہ بڑا لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔

”اب کیا ہوگا گا مو؟“ اللہ وسائی نے اُس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ہوگا چل واپس چلیں اب اگلے ہفتے آ جائیں گے۔“ گا مو چلتے ہوئے اُس امرودوں والے باغ کی طرف جانے لگا جہاں سے گزر کر وہ ڈیرے تک پہنچے تھے۔ اللہ وسائی نے یک دم دلبرداشتہ ہو کر رونا شروع کر دیا۔

”تجھے کہا بھی تھا جلدی چل۔ تو نے کہا نہیں پہنچ جائیں گے آرام سے۔“ وہ اب گا مو سے لڑنے لگی تھی۔

”مجھے کیا پتہ تھا اتنی دور ہوگا ڈیڑھ..... میں کون سا روز روز آتا ہوں یہاں..... پہلی بار آیا تھا۔ ہوگئی بھول چوک آنے میں۔“ گا مو نے بیوی کو روتے دیکھ کر جیسے صفائی دی تھی۔

”میری قسمت میں ہے ہی نہیں اولاد۔ تو دوسری شادی کر لے گا مو۔“ اس کے ساتھ چلتی اللہ وسائی نے یکدم بے حد دلبرداشتہ انداز میں کہا۔

”جھلی ہوگئی ہے تو؟ اگر تیری قسمت میں نہیں ہے تو پھر سمجھ دونوں کی قسمت میں نہیں ہے۔ اس طرح مت مشورے دے مجھے۔“ گا مو نے اُسے جھڑک دیا تھا۔

”تیرے سر پر سوکن لا کر کون بٹھائے گا۔“

”کیوں؟“ اپنا ناک چادر سے سرٹکتی اللہ وسائی نے پوچھا۔

”تیری بد دعائیں کون لے۔ کالی زبان ہے تیری۔“ گا مو نے کانوں کی لوویں چھوتے ہوئے

کہا۔

”میں کیوں دوں گی تجھے بد دعائیں۔“ اللہ وسائی بے ساختہ بولی۔

”زبان سے نہیں دل سے تو دے گی نا..... اور دل سے نکلی بد دعا سیدھا دوزخ میں لے جاتی ہے بندے کو۔“ اُس کی بات پر اللہ وسائی ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

”نہ رو جھلیے چل تجھے حق باہو صاحب کا کلام سناتا ہوں۔ راستہ کٹ جائے گا ہمارا۔“ اُس نے اللہ وسائی کا کندھا تھپک کر نرمی سے اُسے کہا تھا۔ اللہ وسائی نے ناک اور آنکھیں دوپٹے سے رگڑتے ہوئے صاف کر لی تھیں گا مو اُسے رونے نہیں دیتا تھا۔ بھایا بن کر اُس کے زخموں کو مندمل کر دیتا تھا۔

حق باہو کا کلام پڑھتے ہوئے گا مو نے مشک کا پانی امرود کے درختوں کو دینا شروع کر دیا۔ پیر ابراہیم نے اسی باغ میں ایک جگہ سے گزرتے ہوئے گا مو کی آواز میں وہ کلام سنا تھا۔ وہ کلام جتنا پرسوز تھا۔ اُس کو پڑھنے والے کی آواز اُس سے بھی زیادہ پرسوز۔ وہ مسجد میں امامت کروانے جاتے جاتے اُس آواز کے پھندے میں آئے تھے اور پھر جیسے کھنچے چلے آئے تھے اُس طرف جہاں سے گا مو کی آواز آرہی تھی۔ وہ اُن ہی کا باغ تھا اور وہاں پرندے چہچہاتے تھے پر آج گا مو نے جوتان لگائی تھی وہ پیر ابراہیم کے دل کو اس کی مٹھی میں کر گئی تھی۔ چلتے ہوئے آواز کو کھوجتے انہوں نے ایک درخت کو پانی دیتے گا مو کو دیکھ لیا تھا اور اللہ وسائی کو بھی۔ اور جب گا مو سیدھا ہوا تھا تو اُس نے پیر ابراہیم کو بھی دیکھ لیا تھا جو بڑی دور تھے مگر اُن ہی کو دیکھ رہے تھے۔ گا مو یک دم چپ ہو گیا تھا۔ اُسے درختوں کے پار اُس آدمی کو دیکھ کر عجیب ہیبت آئی تھی۔ حالانکہ وہ آدمی بے حد نرم خو لگتا تھا۔ پیر ابراہیم اُس کے قریب آگئے تھے۔

”رُک کیوں گئے بھائی؟ پڑھتے رہو۔“ پیر ابراہیم نے اُس سے بڑی نرمی سے کہا تھا اور جیسے گا مو کو موقع دے دیا اپنا دل کھول کر رکھنے کا۔

”کیا پڑھنا ہے بھائی۔ پیر صاحب کو ملنے آئے تھے۔ وہ ملے ہی نہیں۔ دس میل چل کر آئے ہیں اب پھر دس میل چل کر جائیں گے۔“ پیر ابراہیم نے اُس کی بات بغور سنی پھر اُس سے پوچھا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ گا مو اب مشک کا باقی پانی دوسرے درختوں میں ڈالنے لگا تھا۔

”جھوک جیون سے۔“ اُس نے پیر ابراہیم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”پانی کیوں دے رہے ہو درختوں کو؟“ پیر ابراہیم کو جیسے اُس کی حرکت بے حد عجیب لگی تھی۔

”گا مو ماشکی ہوں۔ پانی پلانا کام ہے میرا، پیر صاحب کے لئے اپنے کنویں کا میٹھا پانی لائے تھے۔ میری بس پانی جتنی ہی اوقات تھی پیر صاحب تو ملے نہیں۔ یہ سوکھے ہیں تو انہیں پلا رہا ہوں تاکہ پیر صاحب کو نہیں تو ان درختوں کو گا مو ماشکی یاد رہ جائے۔“ پیر ابراہیم اُس کی بات پر مسکرائے پھر آگے بڑھ

کر انہوں نے دونوں ہاتھوں کی اوٹ بنا کر گامو سے کہا۔

”لاؤ پلاؤ تاکہ میں بھی یاد رکھوں تمہیں۔“ گامو ماشکی نے اُن کی بات پر توجہ دیے بغیر مشک کو بسم اللہ کہہ کر منہ کھول کر پیر ابراہیم کی ہاتھوں کی اوٹ میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ پیر ابراہیم نے پانی کے کچھ گھونٹ لئے پھر گیلے ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

”میٹھا ہے تمہاری آواز کی طرح۔“ اس سے پہلے کہ گامو کچھ کہتا درختوں میں دو آدمی لپکتے آئے تھے اور اُن میں سے ایک نے پیر ابراہیم سے کہا۔

”پیر صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ میں پیالے میں لا کر پلاتا ہوں آپ کو۔“ گامو ماشکی بے اختیار بدکا تھا اور اس نے ہر اساتھ ہو کر پیر ابراہیم کو دیکھا جواب پانی پی کر سیدھے کھڑے ہو رہے تھے۔

”پیر ابراہیم صاحب ہیں آپ؟“ اُس نے اُن سے پوچھا۔ پیر ابراہیم نے اُس کی بجائے ان دونوں آدمیوں سے کہا۔

”تم لوگ جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں مسجد۔“ وہ آدمی بے حد احترام میں برق رفتاری سے وہاں سے چلے گئے تھے۔

”پیر صاحب ہمارے لئے دعا کر دیں۔“ اللہ وسائی نے تلاتے ہوئے پیر ابراہیم سے کہا تھا۔ پیر ابراہیم نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھے بغیر گامو سے بڑی نرمی سے پوچھا۔

”کیا پریشانی ہے؟“

”دس سال ہو گئے ہیں پیر صاحب اولاد نہیں ہے۔ خالی گھر ہے ہمارا۔ لوگ کہتے ہیں آپ سید ہیں سیدوں کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔“ گامو ماشکی کو رونا آ گیا تھا۔ پیر ابراہیم کے انداز اور آواز میں کچھ نہ کچھ ایسا تھا کہ اُس کا دل چاہ رہا تھا وہ اُن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔

”میں سید نہیں ہوں میری بیوی سیدانی تھیں۔ میں تو گناہ گار ہوں سب جیسا۔“ پیر ابراہیم نے بے اختیار کہا تھا۔

”اپنے آپ کو گناہ گار کہہ کر ہم کو گناہ گار نہ کریں پیر صاحب۔ بس ہمارے حق میں دعا کر دیں۔“ اللہ وسائی نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

پیر ابراہیم یک دم خاموش ہوئے تھے اُن پر جیسے کوئی عجیب سی کیفیت آنی شروع ہو گئی تھی۔ اُن کا سرخ و سفید رنگ یک دم بہت سرخ ہونے لگا تھا اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے کچھ بھی کہے بغیر انہوں نے اپنے ہاتھ کی کلائی میں لپٹے موتیوں کے ایک ہار کو اتار کر گامو کے اُس ہاتھ کی کلائی میں

پہنانا شروع کر دیا جس سے وہ مشک کا منہ کھولتا تھا۔

”بیٹی دے گا اللہ سائیں..... نیک..... روپ والی..... سات گاؤں جس کی بات کریں گے.....
اللہ نیک نصیب کرے اُس کے..... نیکوں سے واسطہ ڈالے۔“

وہ کہہ کر رُک کے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے اور گا مو اور اللہ وسائی اُنہیں تب تک جاتے ہوئے بے یقینی سے دیکھتے رہے جب تک وہ غائب نہیں ہو گئے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد گا مونے اپنی کلائی میں پہنائے جانے والے اُس ہار کو پہلی بار دیکھا تھا جس کی خوشبو امرودوں کے باغ کی خوشبو کو گہنا ہی تھی۔
اُس نے اللہ وسائی کو دیکھا۔ وہ روتی جا رہی تھی۔



دلہن بنی تاجور آنکھیں بند کئے بگھٹی کی سیٹ پر پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ اُس کے قدموں میں بیٹھی اُسے پنکھا جھلتی شکوراں کی نظر تاجور کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ تاجور کو وہ روپ آیا تھا جو شکوراں نے کسی کسی دلہن پر دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے سے شکوراں کی نظر ٹپتی تو اُس کے قیمتی لباس اور گہنوں میں الجھ جاتی۔ اُس کے جسم پر کپڑوں سے زیادہ زیور نمایاں تھا۔ کون سا گہنا تھا جو اُس نے اس وقت پہن نہیں رکھا تھا۔ جھومر ٹیکے سے نو لکھا ہار اور گلو بند تک اور پھر پنچ انگے اور پازیبوں تک، شکوراں کی نظر الجھ الجھ جاتی۔ بھٹک بھٹک جاتی تاجور کی نیند نے جیسے اُسے ایک موقع دے دیا تھا کہ وہ اُسے سر سے پیر تک جی بھر کر دیکھے۔ وہ تاجور ہی کی ہم عمر تھی اور اُن کے گھر میں شروع سے تاجور کی خدمت گارتھی۔ وہ خدمت گار جسے اب تاجور کی شادی کے بعد اُس کے ساتھ ہی بھیج دیا گیا تھا۔ شکوراں کچے پکے راستے پر چلتی اور ہر جھٹکے پر ہلتی بگھٹی کے اندر بیٹھی اُسے پنکھا جھل جھل کرتھک چکی تھی۔ تاجور اُسی کے کہنے پر چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر کے اور سر ٹکا کے بیٹھی تھی ورنہ اُس کا خیال تھا اتنے جھٹکوں میں اُسے نیند کہاں آنے والی تھی مگر پیہ نہیں وہ کیسی تھکن تھی کہ بگھٹی کے اتنے جھٹکوں میں بھی کچھ دیر کے لئے تاجور کو اونگھ آ گئی تھی۔ مگر پھر بگھٹی کا پہیہ کسی بڑے گڑھے میں گر کر نکلا تھا اور تاجور بھی جسے اُس جھٹکے سے گرنے لگی تھی جب شکوراں نے پھرتی سے اُسے سنبھالا تھا۔ تاجور نے جیسے کرنٹ کھا کر آنکھیں کھولیں اور اپنی نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ پہلے شکوراں کو اور پھر اُس بگھٹی کو دیکھا اور پھر یک دم اُسے یاد آیا تھا کہ وہ آج بیاہ کر اپنے سسرال جا رہی تھی..... پیر ابراہیم کی ناز و نعم میں پلی بیٹی پرانی ہو گئی تھی۔ تاجور کا دل یک دم بھر آیا۔ وہ رخصتی کے وقت بھی روئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی حالانکہ چوہدری کرامت پیر ابراہیم کا پرانا

دوست تھا پھر بھی تاجور ”پردیس“ جا رہی تھی۔

”نہ تاجور بی بی اب نہ رونا۔“ شکوراں نے اس کی آنکھوں میں اُبھرتی نمی کو دیکھتے ہی لپک کر اُسے پھولوں کڑھار و مال پکڑایا تھا جسے تاجور نے تھام کر اپنی آنکھیں اُس سے پونجھی تھیں۔

”ابھی کتنا رستہ باقی ہے؟“ اُس نے شکوراں سے یوں پوچھا جیسے وہ بگھی وہ چلا رہی تھی۔

”پتہ نہیں تاجور بی بی..... میں دیکھتی ہوں۔“

شکوراں نے کہہ کر بگھی کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کی۔ کھڑکی چند لمحوں میں ہی کھل گئی تھی اور اُس کے کھلتے ہی گرم لو کے کچھ تھیرے اندر آئے تھے۔ وہ بگھی سوکھے کھیتوں کے بیچوں بیچ چلچلائی دھوپ میں ایک کچے رستے پر ایک دوسری بگھی کے پیچھے دوڑ رہی تھی جس میں چوہدری شجاع اور چوہدری کرامت بیٹھے ہوئے تھے اور تاجور کی بگھی کے پیچھے وہ پچاس ٹانگے دوڑے چلے آ رہے تھے جو اس کی بارات لینے گئے تھے۔

”ہائے میرے ربا اتنا سوکھا! جھوک جیون میں تو پتہ نہیں کب سے بارش نہیں ہوئی۔“ شکوراں جیسے باہر سوکھے کھیت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ تاجور نے بھی کھلی کھڑکی سے ایک نظر باہر ڈالی تھی۔

پیر ابراہیم نے اُسے بتایا تھا کہ چوہدری کرامت کے گاؤں میں تین سال سے بارش نہیں ہوئی اور چوہدری کرامت نے تاجور کا رشتہ بھی اسی اُمید اور آس پر لیا تھا کہ پیر ابراہیم کی بیٹی جس جگہ جائے گی خوشحالی لے کر آئے گی۔ تاجور کی خوش بختی کے کچھ ایسے ہی چرچے تھے ہر طرف۔

پیر ابراہیم نے تاجور کا رشتہ کرتے ہوئے اُس سے اُس کی مرضی پوچھی تھی اور پھر اُسے چوہدری شجاع کو دور سے دکھا بھی دیا تھا اور تاجور نے بڑی خوشی سے چوہدری شجاع کے رشتے کے لئے ہاں کی تھی۔ وہ خوب روٹھا اور چوہدری کرامت کی حویلی میں چوہدرائیں کی وفات کے بعد کوئی عورت نہیں تھی۔ تاجور نے جا کر جیسے وہ جگہ سنبھالی تھی۔ وہ تحکمانہ مزاج رکھتی تھی اور اپنے باپ کے عقیدت مندوں کی عقیدت سے واقف تھی۔ وہ اپنے حسن پر نازاں تھی اور ست بھرائی کے اعزاز پر بے حد مغرور..... تاجور نے ”تھوڑ“ کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ نہ رنگ روپ میں نہ عزت میں نہ پیار میں نہ رزق میں اور نہ ہی قدر میں۔ باپ اُسے اُس کی ماں کی وفات کے بعد اگر ہاتھ کا چھالہ بنا کر رکھتا تھا تو سات بھائی اُسے پلکوں پر اٹھائے پھرتے تھے۔ تاجور نے نہ کبھی سنی ہی نہیں تھی اور ہاں کہنے کی اُسے عادت نہیں تھی۔

”بیٹا شوہر کی عزت کرنا اپس کی پگڑی کا شملہ کبھی اپنے کسی کام سے نیچے نہ ہونے دینا۔“ پیر ابراہیم نے اُسے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہتے مگر اُس کے سر نے آگے بڑھ کر

انہیں روک دیا تھا۔

”تمہاری بیٹی نہیں رہی اب یہ ابراہیم ہماری بیٹی ہو گئی ہے اور میری بیٹی کو اتنی نصیحتیں مت کرو۔“ وہ بچپن کے دوست تھے ایک دوسرے سے اس طرح کی باتیں کر لیتے تھے ورنہ پیر ابراہیم کے سامنے تو کوئی سر اٹھا کر بھی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

”اس کو راج کروانے کے لئے لے کر جا رہا ہوں حکم دینے کے لئے۔ حکم سننے کے لئے نہیں۔“ انہوں نے کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔ پیر ابراہیم مسکرا کر رہ گئے تھے۔ تاجور کا سر کچھ اور اٹھ گیا تھا۔ شکوراں ایک بار پھر کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھنے لگی تھی اور اس بار اُس نے یک دم خوشی سے جیسے فلقاری مارتے ہوئے تاجور سے کہا۔

”تاجور بی بی..... میں نے بدلیاں دیکھی ہیں کالی اس طرف۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے تاجور کو ایک سمت کا بتا رہی تھی۔ تاجور نے بے یقینی سے اُسے دیکھا پھر خود بھی کھڑکی سے باہر جھانکا اُس نے سوکھے کھیتوں کے پار آسمان پر واقعی سیاہ بادل اُڑتے دیکھے۔

”آپ آج جھوک جیون آئی ہیں اور آپ کے برکت والے قدموں کے صدقے آج اللہ نے جھوک جیون کی زمین کی سن لی۔“ شکوراں نے جیسے لہکتے ہوئے کہا۔ تاجور کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

وہ بادل صرف اُن دونوں نے نہیں دیکھے تھے اگلی بکھی میں بیٹھے چوہدری کرامت اور چوہدری شجاع نے بھی دیکھے تھے۔ اور پیچھے بھاگتے پچاس تاگوں میں بیٹھی ہوئی بارات نے بھی پل جھپٹے میں اُن بدلیوں نے آسمان گھیرا تھا اور پھر مینہ برسنے لگا تھا۔

جھوک جیون میں کوئی ایسا آیا تھا جس کے وجود کی برکت نے آسمان سے وہ پانی برسا دیا تھا جس کے برسنے کی دعائیں وہاں کے لوگ تین سالوں سے کرتے پھر رہے تھے۔ بکھی اب سرپٹ دوڑنے کی بجائے اُس برستے مینہ میں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی اور اندر تاجور کسی ملکہ کی طرح غرور سے تن کر بیٹھی کھلی کھڑکیوں سے آنے والے بارش کے پانی میں بھیکے ٹھنڈے جھونکوں سے محفوظ ہو رہی تھی اور شکوراں ہمیشہ کی طرح تاجور بی بی کی خوش بختی کی کرامات دیکھتے ہوئے اُس پر قربان جا رہی تھی۔ سوکھے کھیت پانی کو یوں پی رہے تھے جیسے پیہ نہیں کب سے پانی کے لئے ترسے تھے۔ وہ کچا رستہ جس پر بکھی بھاگ رہی تھی وہ بھی ابھی تک تیز بارش کے باوجود کچڑ میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ زمین پانی پی رہی تھی اور پانی پیتی ہی جا رہی تھی۔

”دیکھ شجاع پیروں کی اولادوں کا نصیب اور برکت دیکھی تو نے۔ اُن کے قدم جہاں پڑتے ہیں ویرانے آباد ہو جاتے ہیں۔ بنجر زمین پھوٹے لگتی ہے۔“ چوہدری کرامت اگلی بگھی میں برستی بارش میں سفر کرتے ہوئے چوہدری شجاع سے کہہ رہا تھا۔

”بس تاجور کا کبھی دل نہ دکھانا کبھی کسی چیز کے لئے منع نہ کرنا اُسے۔ وہ سیاہ کا سفید کرے یا سفید کو سیاہ کرنے دینا۔ وہ پیر ابراہیم کی بیٹی ہے اُس کے طفیل بھاگ لگے رہیں گے تجھے بھی اور تیری نسل کو بھی۔“ چوہدری کرامت نے حویلی پہنچنے کے رستے میں جیسے بیٹے کے لئے زندگی گزارنے کی حد بندی کر دی تھی۔ وہ حویلی میں ملکہ نہیں بادشاہ لارہا تھا۔

تاجور برستی بارش میں حویلی پہنچی تھی اور چوہدریوں کی بہودیکھنے کے لئے گاؤں کے وہ سارے لوگ اُمد آئے تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے بارات کے ساتھ نہیں جاسکے تھے ورنہ چوہدری کرامت نے پورے گاؤں کو بیٹے کی بارات میں مدعو کیا تھا۔

تاجور بگھی سے چادر کا گھونگھٹ کاڑھے حویلی کے صحن میں اُتری تھی اور ساتھ ہی کسی نے اُس پر چھتری تان لی تھی۔ کسی عورت نے اُس کا منہ نہیں دیکھا تھا نہ کسی کو اتنی ہمت ہوئی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر دُہن کا منہ دیکھنے کے لئے چادر ہٹاتا۔ اُس کا رُعب اس لئے تھا کہ وہ چوہدریوں کی بہوتھی اور دھاک اس لئے بیٹھ گئی تھی کہ پیروں کی وہ بیٹی جھوک جیون میں بارش کے ساتھ آئی تھی۔

شکوراں کسی باڈی گارڈ کی طرح تاجور پر تنبوجتنی لمبی ریشمی کڑھائی والی کالی چادر ڈالے اُس کو ان عورتوں سے گزارتے ہوئے اندر لے جا رہی تھی اور ان ہی عورتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے تاجور نے پہلی بار گاموماشکی اور اللہ وسائی کا نام سنا تھا۔ ایک عورت کسی دوسری سے کہہ رہی تھی۔

”کیا خوش بخت اولاد ہے گاموماشکی کی کہ آج دائی نے اللہ وسائی کو پیٹ سے ہونے کی خبر دی اور آج ہی بارش ہونے لگی۔ گامو تو مٹھائیاں بانٹتا پھر رہا ہے پورے گاؤں میں حالانکہ ابھی پہلے مہینے ہی کون مٹھائیاں بانٹتا ہے۔“ دوسری عورت نے ہنس کے کہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے بیٹا ہوگا۔“

”مجھے لگتا ہے بیٹی ہوگی اسی لئے بارش رحمت بن کر آئی ہے۔“

تاجور وہاں سے بھسم ہوتے ہوئے گزری تھی۔ وہ پورا رستہ اپنی برکت اور بخت کی باتیں سنتی آئی تھی اور یہاں کسی نے ایک لمحے میں کسی اور کو اُس کے بخت اور برکت کے ہم پلہ کر دیا تھا اور وہ بھی وہ جو ابھی پیدا میں نہیں ہوا تھا بس ماں کے پیٹ میں آیا تھا۔ تاجور کا بس چلتا تو وہ ان عورتوں کو کھڑے کھڑے

وہاں سے نکال دیتی وہ بھی دھکے دے کر۔ وہ اس کے محل کے درباری تھے کسی اور کے قصیدے کیسے پڑھ سکتے تھے۔ وہ ”آنے والا“ تاجور کے دل و دماغ سے چپک کر بیٹھ گیا تھا۔ جھوک جیون میں چوہدری کرامت چوہدری شجاع کے بعد گامو، اللہ وسائی اور اُن کا ہونے والا بچہ وہ پہلے تین لوگ تھے جن سے تاجور متعارف ہوئی تھی اور تعارف نہیں تھا وہ تیروں کی طرح اُس کے سینے پر لگے تھے۔

”کوئی اندر نہ آئے..... میں آرام کروں گی۔“ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی تاجور نے شکوراں سے سرگوشی میں کہا تھا۔ ملکہ کو تخلیہ چاہیے تھا اُس آگ کو بجھانے کے لئے جو چند جملوں نے لگا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یہ گامو کہاں ہے۔ کوئی اسے بلائے آ کر حق باہوکا کلام پڑھے۔“ چوہدری کرامت کو حویلی پہنچتے ہی گامو یاد آیا تھا۔ اور ساتھ ہی کسی نے اُسے گامو کے گھر اولاد کی خوش خبری کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چوہدری کرامت دل سے خوش ہوا تھا اور ساتھ اُس کا یہ یقین بھی کہ اُس کی بہو کے قدم پڑتے ہی صرف بارش نہیں آئی بے اولادوں کی گودیں بھی ہری ہونے لگی تھیں۔

”بلاؤ گامو کو۔ مجھے کیوں اُس نے سب سے پہلے یہ خبر نہیں دی۔“ چوہدری کرامت کے کہنے پر گامو کی ڈھنڈیا مچی تھی اور وہ چوہدری کرامت کے سامنے آتے ہی اپنا رتبہ اوقات سب بھولتے ہوئے روتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا تھا۔ چوہدری کرامت اُسے تھپکتے ہوئے نم ناک ہو گیا۔

”چل گامو پڑھ حق باہوکا کلام..... میرے بیٹے کی بارات آئی ہے اور تیرے گھر اولاد کی خوش خبری آئی ہے۔ چل پڑھ اسی خوشی میں۔“ چوہدری کرامت نے اُسے کہا تھا اور ساتھ ہی اپنے ملازموں کو کہا کہ گامو کے گھر آنے والی اس خوش خبری پر پورے گاؤں میں مٹھائی چوہدریوں کی طرف سے ہٹے گی۔ گامو جیسے چوہدری کرامت کی اس عنایت پر اور مٹی ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نہ میں عالم نہ میں فاضل نہ مفتی نہ قاضی ہو

نہ دل میرا دوزخ منگے نہ بہشتیں راضی ہو

نہ میں تریے روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہو

باجھ وصال اللہ دے باہو دنیا کوڑی بازی ہو

(نہ میں عالم ہوں نہ فاضل نہ مفتی نہ قاضی)

نہ میرا دل دوزخ مانگتا ہے نہ بہشت کا لالچ رکھتا ہے

مجھ خطا کار نے نہ تو مقبول روزے رکھے ہیں نہ میں پاک نمازی ہوں

اللہ دل میں نہ سما یا ہو تو ساری دنیا جھوٹ کے سوا کچھ نہیں)

اندر اپنے کمرے میں شربت پیتی تاجور گامو ماشکی کی آواز پڑھ چکی تھی۔ اُس نے شکوراں کو دیکھا جو اُسی کی طرح جیسے ساکت بیٹھی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ گامو سانس لینے کے لئے رُکا تھا اور تاجور نے شکوراں سے کہا تھا۔ شکوراں جلدی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ تاجور ایک بار پھر گامو ماشکی کو سننے لگی تھی۔ شکوراں اس بار اندر آئی اور اُس نے کہا۔

”گامو ماشکی ہے کوئی۔“ تاجور بُری طرح چوکی تھی۔ اُس نے شکوراں سے مزید کوئی سوال جواب نہیں کہا تھا۔ وہ شربت پیتے ہوئے وہ کلام سنتی رہی اور شکوراں بھی گم صم وہاں بیٹھی رہی جب گامو ماشکی کی آواز بند ہو گئی تو شکوراں نے اپنے بازو تاجور کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

”بی بی صاحبہ دیکھیں میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے ہیں اس آدمی کی آواز سن کر۔“ تاجور نے ایک نظر شکوراں کو دیکھا پھر بے حد سرد آواز میں اُس سے کہا۔

”باہر مردان خانے میں کسی کے ہاتھ پیغام پہنچاؤ کہ وہاں سے کوئی آواز اندر زنان خانے نہیں پہنچنی چاہیے۔ جو مردان خانے بیٹھے آواز نیچی کر کے بیٹھے۔ ہم سیدوں کی اولاد ہیں۔ مردوں کی آوازوں سے بھی پردہ کرتے ہیں۔“ شکوراں تاجور کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی مگر کوئی سوال کئے بغیر وہ برق رفتاری سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تو کدھر جا رہی ہے اللہ وسائی؟“ حویلی کی طرف سے آتی ہوئی عورتوں میں سے ایک نے اللہ وسائی سے کہا جو حویلی جانے والے راستے پر اُنہیں نظر آئی تھی۔

”میں چوہدریوں کی بہو دیکھنے جا رہی ہوں بارات میں نہیں جاسکے میں اور گامو۔ میری طبیعت خراب تھی صبح سے۔ اب سنبھلی ہے تو آئی ہوں۔“ اللہ وسائی نے کہا۔

”ارے جا کر آرام کر! اس حالت میں اس طرح لور لور نہیں پھرتے اور چوہدریوں کی بہو نے گاؤں کی کسی عورت کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ تو بھی وقت ہی کھوٹا کرے گی خواہ مخواہ جا کے۔“ ایک عورت

”نہ نہ میں تو ضرور جاؤں گی گا مو ماشکی کی بیوی ہوں مجھے کیسے انکار کریں گے چوہدری صاحب۔“
 اللہ وسائی نے اُن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیئے تھے۔ موسلا دھار بارش
 اب ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی حویلی پہنچتے پہنچتے اللہ وسائی کے کپڑے بھیک چکے تھے۔
 بڑی چوہدرائیں کے ہوتے ہوئے اللہ وسائی حویلی کے کام کاج اور دانے لینے کے لئے آتی رہتی
 تھی۔ اس لئے اُسے حویلی کے ہر کمرے کا پتہ تھا۔

وہ شکوراں تھی جس نے بھیکے ہوئے کپڑوں والی اللہ وسائی کو روکا تھا جس کے ہاتھوں میں موتیے
 کے پھولوں کی ایک ٹوکری تھی اور جو اپنی چپل باہر والے برآمدے میں اتار کر اندر آ گئی تھی۔
 ”کدھر آرہی ہے تو؟“ شکوراں نے اُسے چوہدری شجاع کے کمرے کے باہر جھڑکا اور اللہ وسائی کو
 بُرا لگا۔

”میں گا مو ماشکی کی بیوی ہوں اللہ وسائی۔ بہو کی منہ دکھائی کے لئے آئی ہوں۔“ اندر سنگھار میز
 کے آئینے کے سامنے دوپٹہ ٹھپک کرتی تاجور باہر سے آئی آواز سن کر ساکت ہوئی تھی۔
 ”تجھے بتایا نہیں کسی نے کہ بہو صاحبہ نہیں ملیں گی کسی سے۔“ شکوراں نے اُسی انداز میں اس سے
 کہا۔

”مجھ سے مل لیں گی۔ میں گا مو ماشکی کی بیوی ہوں۔ وہ ماشکی ہے سارے گاؤں کا..... اُسے کوئی
 انکار.....“ شکوراں نے بے حد بدتمیزی سے اُس کی بات کاٹی
 ”تجھے ایک بار کہہ دیا نا کہ بہو صاحبہ نہیں ملیں گی اور.....“

اس سے پہلے کہ شکوراں کچھ کہتی اندر سے تاجور نے آواز دی تھی۔
 ”اُسے آنے دو اندر۔“ شکوراں بے یقینی سے کھڑی رہ گئی۔
 اللہ وسائی نے بڑے تفاخر سے اُسے دیکھا اور اُس دروازے کی طرف بڑھ گئی جو شکوراں نے اُس
 کے لئے کھولا تھا۔

اللہ وسائی کمرے میں جھجکتے ہوئے داخل ہوئی تھی۔ تاجور سامنے ہی کھڑی تھی۔ اور اُس پر پہلی نظر
 ڈالتے ہی اللہ وسائی فدا ہو گئی تھی۔

”یا اللہ میری بیٹی کو بھی ایسا حسن دینا کہ جو دیکھے میری طرح دیکھتا ہی رہ جائے۔“ اُس کے اندر
 کہیں ایک خواہش پیدا ہوئی تھی۔

تاجور بھی اُسے اسی طرح پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اللہ وسائی آگے بڑھی تھی اور اُس نے پھولوں کی وہ ٹوکری تاجور کے قدموں میں رکھ کر اُسے مہندی رچے حسین پیر پکڑ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تاجور حواس باختہ ہوئی۔

”پیر صاحب کی دُعا سے دس سال بعد آج گودہری ہوئی ہے میری۔ انہوں نے دُعا دی تھی مجھے کہ بیٹی ہوگی اور میں آج اُن کی بیٹی کے پیر دھونے آئی ہوں۔“ اللہ وسائی نے روتے اور تلاتے ہوئے تاجور کو بتایا تھا اور تاجور کے جلتے وجود پر جیسے پانی نہیں شبنم گری تھی۔ تو اُس کو کھ میں آنے والی اولاد بھی اُس کے باپ کی دعاؤں کے طفیل تھی اور جس کی کوکھ ہری ہوئی تھی وہ احسان فراموش نہیں نکلی تھی نہ ہی اپنی اوقات بھولی تھی۔ وہ وہیں آ کر بیٹھی تھی جہاں اُسے بیٹھنا چاہیے تھا۔ تاجور کی آگ نہیں بجھی غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

”چل اُٹھ پیر دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اُس نے اللہ وسائی کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑائے تھے۔ اللہ وسائی نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کئے اور وہیں زمین پر بیٹھے موتیے کے پھولوں کے گجرے والی ٹوکری تاجور کی طرف بڑھا دی۔

”ہماری اوقات بس یہی لانے کے برابر ہے۔ پیر صاحب نے بھی میرے گامو کو یہی پھول دیئے تھے میں بھی آپ کے لئے انہیں پھولوں کا گجرہ بنالائی ہوں۔“ وہ تلاتے ہوئے کہتی گئی تھی۔ تاجور نے ایک نظر اُن پھولوں کو دیکھا پھر اُس سے کہا۔

”ٹھیک ہے رکھ دے اسے وہاں..... اور شکوراں کسی سے کہہ کر اسے پانی پلا دے۔“ یہ جیسے اس بات کا اشارہ تھا کہ اللہ وسائی اب یہاں سے جائے۔

شکوراں جی بی بی صاحبہ کہہ کر اُسے لے کر وہاں سے چل دی تھی۔ تاجور فرش پر پڑی پھولوں کی اُس ٹوکری کو دیکھتی رہتی جس سے اٹھنے والی خوشبو نے لمحوں میں اُس کے پورے کمرے کو معطر کر دیا تھا۔ شکوراں کچھ دیر بعد اندرائی اور اُس نے آ کر ٹوکری اٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کہاں رکھوں؟“

”باہر پھینک دو۔“ تاجور نے عجیب بے نیازی سے کہا۔ وہ اب سیج پر بیٹھنے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

شکوراں پھول لئے باہر آ گئی مگر انہیں پھینکنے کی بجائے اُس نے وہیں برآمدے میں انہیں

دروازے کی چوکھٹ پر لٹکا دیا۔ موتیا کے گجرے وہاں لٹکے اب اپنی خوشبو ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ وہ چوہدری شجاع تھا جس نے اندر جاتے ہوئے موتیے کے اُن خوبصورت گجروں کو دیکھا تھا اور اُنہیں تاجور کے کلائیوں میں پہنانے کے لئے اُتار لیا تھا یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ گجرے تاجور کے لئے اُس کے باپ نے اپنے باغ سے چنوا کر بنوائے تھے۔

اُس رات اپنی سیج پر موٹیے کے اُن گجروں کو پہنتے ہوئے تاجور کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اللہ وسائی کے ہاتھوں کے بنے گجرے تھے جنہیں اُس نے باہر پھینکوا یا تھا مگر جو چوہدری شجاع کے ہاتھوں اُس کی کلائیوں میں آکر لپٹ گئے تھے۔ اُس کی سیج کی زینت بن گئے تھے۔



”تاجور بی بی ایسی حسین ہیں گا موکہ اُن سے نظریں نہیں ہٹتی۔ میں تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔“
اللہ وسائی نے اُس شام گا مو کو تاجور کے بارے میں بڑے اشتیاق سے بتانا شروع کیا تھا جب گا مونے اُسے ٹوک دیا۔

”نہ نہ اللہ وسائی پیر صاحب کی بیٹی کے حسن کے بارے میں کسی غیر محرم سے بات نہ کر سیدوں کی بیٹیوں کے پیچھے بھی اُن کے بارے میں بات نہیں کرتے۔“

”پتہ ہے مجھے پر پھر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں۔“
”کچھ نہ بتا مجھے اور نہ ہی مجھے سننا ہے۔ بس تو اُن سے پوچھ کر اُن کی خدمت کے لئے چلی جایا کر۔“ گا مونے اُس سے کہا تھا۔

”لے ایک طرف تو مجھے کام کرنے سے روک رہا ہے اور دوسری طرف اُن کی خدمت کے لئے جانے کا کہہ رہا ہے۔“ اللہ وسائی نے ہنس کر جیسے گا مو کو یاد دلایا تھا۔
”اُن کی خدمت کرنے سے کچھ نہیں ہوگا تجھے۔ اُنہیں کے گھر کے طفیل تو رب سوہنے نے نوازا ہے ہمیں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے تو..... پر تجھے وہاں کلام پڑھنے سے کیوں روک دیا انہوں نے؟“
”جھلی بتایا تو ہے سیدوں کی بیٹیاں غیر محرموں کی آوازوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ میری ہی غلطی تھی میں اتنی اونچی کلام پڑھنے بیٹھ گیا۔ اب ہمیشہ نیچی آواز میں کلام پڑھوں گا وہاں۔“ گا مو جیسے خود ہی اپنی اصلاح کرتے ہوئے بولا۔

”گامو میں موتیا کے گجرے لے کر گئی تھی اُن کے لئے اپنے باغوں سے بنا کر..... پتہ نہیں انہوں نے پہنے یا نہیں۔“ اللہ وسائی کو رہ رہ کر خیال آرہا تھا۔ اُن پھولوں کو اس نے طبیعت خراب ہونے کے باوجود بھی صبح سویرے جگہ جگہ سے چنا تھا۔

”تو نے دل سے بنائے ہیں تو انہوں نے ضرور پہنے ہوں گے۔“ گامو نے جیسے اُس کی دلجوئی کی تھی۔

”ہاں بنائے تو دل سے ہی تھے۔ یہ دیکھ پروتے ہوئے کتنی بار سوئی لگی ہے انگلیوں میں۔“ اُس نے گامو کے سامنے اپنے ہاتھ کرتے ہوئے کہا۔
گامو جیسے تڑپ اٹھا تھا۔

”جھلیئے احتیاط سے کام کرنا تھا کیسے اُدھیر دی ہیں اپنی انگلیاں سوئی سے۔ بس اب کوئی سینے پرونے کا کام نہیں کرنا تو نے پھول تک نہیں پرونے تو نے۔“
اللہ وسائی منہ میں دوپٹہ دبائے ہنستی ہی چلی گئی۔

”لو بھلا اب تو پھولوں سے بھی دور رکھے گا مجھے..... ابھی تو پھولوں کا وقت آیا ہے۔ میں نے تو اپنی بیٹی کا نام بھی موتیا ہی رکھنا ہے گامو تا کہ اُس کے حسن کی خوشبو بھی پوری دنیا میں پھیلے۔“ گامو نے پیار سے اُسے دیکھا۔

”لے تو نے نام بھی سوچ لیا اور مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا۔“
”میں نے نام نہیں سوچا۔ پیر صاحب نے موتیا ہی پکڑا تھا نا تجھے۔ میں نے تو اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ اللہ اچھا وقت لائے تو بس موتیا ہی نام ہوگا اُس کا۔“ اللہ وسائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گامو سر ہلاتا چلا گیا۔

”ہاں پیر صاحب نے تو موتیا ہی دیا تھا۔ تو بس موتیا ہی ہوگا اُس کا نام۔“
☆.....☆.....☆

شکوراں نے اگلی صبح وہ گجرے تاجور کے بستر کے برابر پڑی میز پر دیکھے تھے اور اُس نے پلک جھپکتے میں اُنہیں پہچانا تھا۔

”یہ گجرے یہیں رہنے دینا چوہدری صاحب نے پہنائے تھے مجھے۔ مرجھا بھی جائیں نا تو کوڑے میں مت پھینکنا کہیں مٹی میں دبا دینا۔“

اپنے گیلے بال سلجھاتے ہوئے تاجور نے شکوراں سے کہا تھا اور شکوراں ڈر کے مارے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ اللہ وسائی کے گجرے تھے۔ جی بی بی صاحبہ کہہ کر وہ بات گول کر گئی تھی۔ صبح سویرے اپنی شامت بلانے کا اُس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”یہ پانی کتنا کھارا ہے۔“ ناشتے پر تاجور نے پانی کا ایک گھونٹ بھرتے ہی چوہدری شجاع سے ناک بھوں چڑھا کر کہا تھا۔

”اچھا..... نہیں مجھے تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ گھر کی کھوئی کا پانی ہے۔“ شجاع نے اپنی حسین و جمیل بیوی کی چڑھی ہوئی ناک اور ماتھے کے بل دیکھے اور پانی کا ایک گھونٹ لے کر جیسے پانی چکھا۔ اُسے وہ ٹھیک ہی لگا تھا۔

”ہمارے گھر کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ میں بابا جان سے کہوں گی وہ بھوادیہ کریں۔“ تاجور نے وہ پانی وہیں اُسی طرح گلاس میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اتنا کھارا پانی تو میرے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔“ شجاع اس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔

”دس میل دور ہے تمہارا گاؤں..... کیسے بھیجیں گے اور کتنا بھیجیں گے۔“

شجاع نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

”وہ بھیج دیں گے میرے لئے روزانہ..... ہر روز ایک بھائی بھی دینے آئے اُن سمیت تو آٹھ دن تو گھر کے لوگ ہی بھگتا دیں گے پھر ملازم وغیرہ آجائیں گے۔“ شجاع نے لاڈ پیار اور ناز و نعم کی اُس انتہا کے بارے میں سوچا تھا جس کی عادی اُس کی نئی نویلی دلہن تھی۔

”بیٹا اب گھر کے مرد پانی ڈھوتے اچھے تھوڑی لگتے ہیں۔ گاؤں کے کنویں کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے میں گامو ماشکی سے کہوں گا وہ دے جایا کرے گا تمہارے لئے پانی۔“

چوہدری کرامت نے اُن کی گفتگو میں پہلی بار مداخلت کی۔ تاجور کے ذہن میں گامو ماشکی کا نام گونجا تھا۔ اُس نے صرف چوہدری کرامت کو دیکھا اور کچھ کہا نہیں۔

پندرہ منٹ بعد گامو ماشکی حویلی پانی پہنچا گیا تھا اور تاجور ذہن بنائے بیٹھی تھی کہ وہ اس میں بھی نقص نکالے گی۔ مگر پہلا گھونٹ لیتے ہی تاجور کچھ بول نہیں سکی تھی۔ وہ ایسا ٹھنڈا میٹھا پانی تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غٹا غٹ پیتی چلی گئی۔ چوہدری کرامت اور شجاع نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”ہاں یہ کچھ بہتر ہے پر ہمارے گھر کے کنویں جیسا نہیں ہے۔“ تاجور نے گلاس رکھتے ہوئے

دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا تھا۔ چوہدری کرامت ہنس پڑا تھا۔

”وہ پیر ابراہیم کے گھر کا پانی ہے اُس کا اور میرے گھر کے پانی کا کیا مقابلہ۔ پر اب تم آگئی ہو تو میرے گھر کے کنویں کے پانی میں بھی وہی مٹھاس آجائے گی انشاء اللہ۔“ تاجور کچھ بول نہیں پائی۔

چوہدری کرامت کی اس بات کے بعد گامو ماشکی کے لائے ہوئے پانی کا ذائقہ اُس دن تاجور کی زبان پر سارا دن رہا۔ وہ چوہدری کرامت کے سامنے یہ اعتراف نہیں کر سکی کہ گاؤں کے کنویں کا وہ پانی جو گامو ماشکی لایا تھا وہ پیر ابراہیم کے گھر کے پانی سے بھی میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔

☆.....☆.....☆

UA BOOKS

گندم کی ایک بوری کا منہ کھلا ہوا تھا اور اُس کے برابر میں گندم کی چند اور بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں تاجور برآمدے میں ایک اونچے موڑھے پر بڑے کروفر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اُس کے پاس شکوراں اور کچھ دوسری ملازمائیں تھیں۔ حویلی کے صحن میں عورتیں قطار بنائے کھڑی تھیں اور باری باری آگے آکر اس حویلی کی نئی بہو سے پہلی خیرات لے رہی تھیں۔ شکوراں برتن بھر بھر کے بوری سے دانے تاجور کو دیتی اور وہ عورتوں کی جھولی، چادر یا لائے ہوئے برتنوں میں اُنڈیل دیتی اور ساتھ اُن کی دعائیں لیتی اور بڑے کروفر سے اُن دعاؤں کا جواب بھی دیتی لیکن کسی کو آگے بڑھ کر خود کو چھونے نہ دیتی۔ اللہ وسائی بھی اُسی قطار میں کھڑی تھی جب اُس نے ایک بوڑھی عورت کو آگے بڑھ کر تاجور کے سر پر پیار دینے کی کوشش کرتے دیکھا اور تاجور کو بے حد بے زاری کے ساتھ اُس کا ہاتھ جھٹکتے دیکھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے اماں۔“ اُس کے کہنے پر شکوراں نے بڑی درشتگی سے اُس عورت کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں لگتا تم لوگوں کو..... کتنے گندے ہاتھ ہیں تمہارے اور بی بی صاحبہ کے سر پر پھیر کر اُن کے بال بھی گندے کرو گی..... پاکی پلیدی کا کچھ پتہ نہیں تجھے۔ وہ عورت کچھ جھل سی ہو گئی اور اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اللہ بی بی اور چھوٹے صاحب کی جوڑی سلامت رکھے۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اب دانے لے اور آگے چل۔“ شکوراں نے کٹوری اُس تاجور کو پکڑاتے ہوئے اُس عورت کی چادر پھیلانی تھی اور تاجور نے کچھ کہے بغیر اُس میں دانے ڈال دیئے تھے۔

اللہ وسائی کے آنے سے پہلے ہی تاجور اُسے دیکھ چکی تھی اور تاجور کی نگاہ جہاں مرکوز ہوئی تھی یہ کیسے

ممکن تھا کہ شکوراں تاجور کی نگاہ نہ پہچانتی۔

”آؤ اللہ وسائی۔“ تاجور نے خود اُسے نام لے کر پکارا تھا اور جیسے پورے گاؤں کی عورتوں کے سامنے لمحہ بھر کے لئے اللہ وسائی کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ چوہدریوں کی بہو کو نہ صرف اُس کا چہرہ یاد تھا بلکہ نام بھی یاد تھا۔

”بابا جان کی دُعا سے دس سال بعد گودہری ہو رہی ہے ناتھہاری۔“ تاجور نے بلند آواز میں جیسے پورے گاؤں کے سامنے اعلان کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ اللہ وسائی اُسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔

”اُسے دو کٹوری دینا..... یہ تھتھی بھی تو ہے نا۔“

تاجور نے مسکراتے ہوئے شکوراں سے کہتے ہوئے اللہ وسائی کو دیکھا جس کا رنگ فق ہوا تھا اور وہاں کھڑی عورتوں کی پوری قطار نے بیک وقت قہقہہ لگایا تھا۔ تاجور نے پہلی بار وہاں کوئی مزاح کی بات کی تھی اور کسی کو ہنسی نہ بھی آرہی ہو تو بھی ہنسنا ضروری تھا۔ صرف جھولی پھیلائے ہوئے اللہ وسائی تھی جو شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ اُس سے اُس دن سر ہی نہیں اٹھایا گیا تھا نہ اُس کی زبان سے کچھ نکلا تھا۔ وہ کچھ بولتی تو تھتھی کہلاتی اور سب اُس پر ہنستے۔

اللہ وسائی اُس دن سارا راستہ روتی آئی تھی۔

”میں نے آئندہ دانے لینے حویلی نہیں جانا گامو۔“ اُس نے گھر آتے ہی گامو کو سب کچھ کہہ سنایا تھا۔ اُس کا بھی دل بُرا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے اللہ وسائی سے کہا تھا۔

”تجھے کتنی بار کہا ہے۔ وہ پیر صاحب کی بیٹی ہیں جن کے فیض سے ہمارا گھر آباد ہونے جا رہا ہے۔ چوہدری صاحب کی بہو بہن جن کے گھر سے آنے والے دانے سے ہمارا چولہا جلتا ہے۔ تو دل میلانہ کیا کرنے بُرا منایا کر اُن کی بات کا۔ دیکھنا انہوں نے سارے پنڈ کو چھوڑ کر صرف تیرے ساتھ مذاق کیا۔“ گامو نے جیسے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ پر اللہ وسائی اُس کی بات پر جیسے بلبلا اُٹھی تھی۔

”اس گاؤں میں آج تک کبھی کسی نے مجھے تھتھی نہیں کہا۔ کبھی کوئی مجھ پر نہیں ہنسا آج اُن کی وجہ سے گاؤں کی عورتیں ہنسی ہیں مجھ پر..... کل وہ تھتھی تھتھی کہہ کر گلیوں میں بلائیں گی مجھے۔“ اللہ وسائی پھر رو پڑی تھی۔

”نہرو اس طرح اللہ وسائی جانے دیں پیر صاحب کا احسان اتنا بڑا ہے کہ اُن کی بیٹی کو سات خون معاف ہیں..... تو غصہ اور رونا چھوڑ..... یہ دیکھ کیا لایا ہوں میں۔“ گامو نے اس کا دل بہلاتے ہوئے

ایک پوٹلی کھول کر اُس میں سے خوبصورت کپڑے نکالے تھے جو ایک ننھے بچے کے تھے۔ اللہ وسائی یک دم رونا بھولی۔

”یہ کہاں سے لایا ہے تو؟“

”جہاں سے بھی لایا ہوں تو یہ دیکھ ہیں کتنے سوہنے جب ہماری دھی یہ پہنے گی تو شہزادی لگے گی بالکل۔“

”ہاں روپ والی شہزادی..... میں کہتی ہوں تاجور بی بی جیسی سوہنی ہو اُن جیسا غرور نہ ہو اُس میں۔“ اللہ وسائی نے بے اختیار کہا تھا۔ گا موسکرا دیا تھا اللہ وسائی اب وہ ننھے ننھے رنگین کپڑے کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

گا موسکی بھول تھی کہ اللہ وسائی سب بھول گئی تھی۔ وہ اُس دن کے بعد سے دوبارہ حویلی نہیں گئی تھی۔ تب بھی نہیں جب مہینے کے بعد ہی تاجور کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر گاؤں میں پھیلی تھی اور چوہدری کرامت نے اناج کی بوریاں ایک بار پھر کھول دی تھیں۔ اُس نے تاجور کے لئے دعا کی تھی لیکن اُس کو جا کر ملی نہیں تھی اور تاجور کو بھی اُس کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ حویلی کی اگلی نسل کو دُنیا میں لانے میں اتنی مصروف تھی کہ اللہ وسائی کے ساتھ ساتھ گا موسا شکی بھی اُسے بھول گئے تھے۔

مراد ساتویں مہینے پیدا ہوا تھا اور پریشانی اُٹھانے کے باوجود وہ صحت مند تھا۔ اُس کی پیدائش پر حویلی میں کئی ہفتے جشن کا سماں تھا اور اُسی جشن میں کسی نے تاجور کو اللہ وسائی کے ہاں پیدا ہونے والی بیٹی کی خبر دی تھی۔

”بی بی صاحبہ گاؤں کی عورتیں کہہ رہی ہیں کہ اللہ وسائی کی دھی تو رنگ روپ میں آپ پر چلی گئی ہے۔ وہ تو اللہ وسائی کی دھی لگتی ہی نہیں۔“ شکوراں نے اُس دن تاجور کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرتے ہوئے جیسے اُس کو خنجر گھونپا تھا۔

”تجھے بات کرتے ہوئے لحاظ نہیں آتا کس کی اولاد کا رنگ روپ مجھ سے ملتا رہی ہے۔“ تاجور خفا ہوئی تھی۔ شکوراں گرڑ بڑائی۔

”نہیں نہیں بی بی صاحبہ میں نے کہاں سے دیکھنا ہے۔ آپ کہیں تو دیکھ کے آؤں؟“

شکوراں نے جھٹ تجسس سے کہا تھا۔

”ہاں جادیکھ کر آ اور مبارکباد بھی دے آنا میری طرف سے۔“ تاجور کو عجیب کرید ہوئی تھی اور شکوراں بے اختیار اس طرح خوش ہوئی جیسے اُس کی دلی مراد پوری ہوئی تھی۔

گاؤں کی عورتیں فضول میں بک بک نہیں کر رہی تھیں۔ شکوراں اللہ وسائی کی بیٹی پر پہلی نظر ڈالتے ہی دنگ رہ گئی تھی۔ دودھ جیسی رنگت والی گلابی ہونٹوں والی وہ بچی ہر نی جیسی آنکھیں کھولے کسی غزل کی معصومیت سے شکوراں کو دیکھ کر مسکرائی تو شکوراں کا دل بے اختیار پیار سے پگھلا تھا اُسے وہ اپنی چھ مہینے کی بتول جیسی لگی تھی۔ پر بتول اور اُس میں ”روپ“ کا فرق تھا۔

”یہ تو تیری بیٹی لگتی ہی نہیں۔“ شکوراں اُسے گود میں لئے کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور اللہ وسائی نے موتیا اُس سے جھپٹ لی تھی۔

”میری نہیں تو اور کس کی بیٹی ہوگی۔ چل جا یہاں سے۔“ وہ شکوراں سے خفا ہو گئی تھی جب سے موتیا اُس کی زندگی میں آئی تھی۔ اُسے کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ اور گامو اب موتیا کے گرد طواف کرتے رہتے تھے۔



شکوراں نے واپس جا کر موتیا کا ویسا ہی نقشہ کھینچا تھا جیسا وہ دیکھ کے آئی تھی۔ وہ نہ جھوٹ بول سکی تھی نہ اُس کی کوئی خامی بیان کر پائی تھی۔ تاجور نے ماتھے پر بل لیتے مراد کو جھولے میں جھلاتے ہوئے اُس کی بات سنی تھی اور پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اُس کے بیٹے مراد کا گاؤں میں کہیں چرچا نہیں ہوا تھا روپ رنگ میں..... وہ صرف چوہدری شجاع کے بیٹے کے طور پر ہی یاد تھا سب کو..... لیکن جو قصیدے موتیا کے سننے میں آرہے تھے۔ وہ تاجور کو ہضم نہیں ہو پائے تھے۔

اللہ وسائی چھلہ نہا کر حویلی آئی تھی وہ پہلی بار تاجور کو مراد کی مبارکباد دینے آئی تھی اور تاجور نہ چاہنے کے باوجود اُسے اندر بلانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”یہ کیا لائی ہو تھ تھی؟“ تاجور نے جان بوجھ کر اُسے اُسی نام سے پکارا اللہ وسائی نے جیسے کان بند کر لئے تھے۔ اُس کے اندر اب غصہ رہا ہی نہیں تھا۔

”یہ گڑ ہے۔ موتیا چھلے کی ہوئی ہے تو بانٹ رہے ہیں پورے گاؤں میں۔“ تاجور نے شکوراں کو اشارہ کیا تھا اور اُس نے وہ گڑ پکڑ لیا تھا۔

”سننا ہے تمہاری بیٹی بڑی روپ والی ہے۔“ تاجور نے کچھ عجیب سے انداز میں اللہ وسائی سے کہا

تھا۔ اللہ وسائی کا چہرہ چمکا تھا۔

”شکر ہے رنگ روپ میں تجھ پر اور گامو پر نہیں چلی گئی۔“ تاجور نے عجیب کاٹ دار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”ہاں جی رنگ روپ تو آپ کا لے آئی ہے چوہدرائے جی..... میں جب بھی آپ کو دیکھتی تھی تو دُعا کرتی تھی اللہ اُسے آپ جیسا رنگ روپ اور نصیب دے میرے جیسا نہیں..... اللہ نے میری سن لی۔“ اللہ وسائی کے جملوں نے تاجور کو عجیب طرح سے چٹایا تھا۔

”نہ تمہاری بیٹی کا رنگ روپ میرے جیسا ہے اور نہ ہی نصیب میرے جیسا ہونا ہے تھکتی۔ میں پیروں کی دھبی ہوں چوہدریوں کی بہو..... وہ کمی کینوں اور ماشکیوں کی دانے ڈال دے اسے شکوراں۔ اس کے بھی اور اس کی بیٹی کے لئے بھی۔“

تاجور کہہ کر اٹھ گئی تھی پر جاتے جاتے اللہ وسائی کے منہ پر جیسے جوتا مار گئی تھی۔ شکوراں کو جیسے پہلی بار تاجور کے جملے اچھے نہیں لگے تھے۔

”چل تو دل پہ نہ لینا..... یہ پیر اور سیّد غصے کے بڑے ڈاڈے ہوتے ہیں پردل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تو لے جایہ دانے..... میں آؤں گی بتول کو لے کر کسی دن۔“ شکوراں نے تاجور کے جانے کے بعد بڑی مدہم آواز میں اُس سے کہا تھا اور پھر اُسے دانوں کا ایک بھرا ہوا تھیلہ اٹھا دیا۔ اللہ وسائی ایک لفظ بھی کہے بغیر گئی تھی۔ شکوراں اندر کمرے میں آئی۔

”بی بی صاحبہ یہ گڑ کا کیا کرنا ہے؟“

اُس نے اللہ وسائی کے لائے ہوئے گڑ کا پوچھا۔

”باہر پھینک دے پتہ نہیں کون کون سے ٹونے کر کے لے آئی ہیں عورتیں بیٹھے پر۔“ تاجور نے مراد کو جھلاتے ہوئے کہا تھا۔ اُس کے کانوں میں ابھی بھی اللہ وسائی کے جملے گونج رہے تھے اور وہ یوں جھنجلا رہی تھی جیسے اللہ وسائی اُس کا رنگ روپ اور نصیب چوری کر کے لے گئی تھی اپنی بیٹی کے لئے۔



سال کی موتیا صحن میں چلنا سیکھ رہی تھی اور گامو اور اللہ وسائی اُسے بیٹھے دیکھتے ہوئے جیسے اُس پر قربان جا رہے تھے۔

”دیکھ کیسے چلتی ہے میری موتیا اللہ وسائی جیسے ہوا میں چل رہی ہو۔“ گامو نے کہا تھا اور پھر اپنی

بات پر خود ہی ہنس پڑا۔

”تو نے بال دیکھے ہیں اس کے گامو..... ریشم ہے ریشم..... نہ تیرے بال ایسے ہیں نہ میرے.....
یہ کہاں سے لے آئی یہ بال۔“ اللہ وسائی منجی کو پکڑ کر اُس کے پاس آنے کی کوشش کرتی موتیا کو دیکھ کر کہا تھا
وہ اب اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”تو رنگ روپ دیکھ، نین نقش دیکھ..... میری تو سات پشتوں میں کوئی ایسا نہیں ہے اللہ وسائی۔“
گامو ہر روز کی طرح آج بھی بیٹی کو بیٹھے دیکھتا اُس کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔

”نہ کیا کرا ایسے گامو..... نہ گنا کر میری موتیا کے نین نقش..... نظر لگتی ہے۔“
اللہ وسائی نے یک دم موتیا کو اٹھا کر گود میں لیٹے ہوئے اوڑھنی ڈال کر جیسے اُسے گامو کی نظر سے
بھی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے تو..... تو روک دیا کر مجھے۔“

گامو نے فوراً ہتھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اب اوڑھنی سے نکلنے کے لئے مچلتی ہوئی موتیا کو بھی نہیں
دیکھ رہا تھا۔

”میں کیا کروں مجھے خود بھی خیال نہیں رہتا۔“ اللہ وسائی نے ہنستے ہوئے موتیا کو ایک بار پھر آزاد
کرتے ہوئے کہا۔

”تجھے پتہ ہے گامو میرا دل کیا کرتا ہے؟“ اس نے چارپائی سے اترتی موتیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”کیا؟“ گامو نے جواباً پوچھا۔

”میں موتیا کو پڑھاؤں لکھاؤں۔“ گامو نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا۔
”پڑھاؤں لکھاؤں؟“

”ہاں جیسے تاجور بی بی کو پڑھایا ہے پیر صاحب نے۔ میں سوچتی ہوں اُسے وہ ڈاکڑنی نہ بنادیں
جو کبھی کبھی گاؤں کی ڈسپنسری میں آتی ہے۔“ اللہ وسائی کے خوابوں پر کوئی قید ہی نہیں تھی۔

”ہاں ڈاکڑنی بن جائے تو اچھا ہے پر تیرے میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں؟“
گامو نے سر کھاتے ہوئے بیوی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

”تو جمع کر لیتے ہیں گا..... ابھی تو بڑا وقت پڑا ہے اس کے بڑے ہونے میں تب تک جوڑ لیں گے
اتنا پیسہ۔“ اللہ وسائی نے فوراً سے بیشتر کیا تھا۔

”ہاں پر پتہ نہیں برادری والے کیا کہتے ہیں..... گاؤں میں رواج کہاں ہے لڑکیوں کو بڑھانے

کا۔“ گامو کو خیال آیا تھا۔

”رواج تو پڑتے ہیں گامو..... ہم ڈالیں گے رواج..... موتیا پڑھ کے ڈاکٹر بن گئی تو گاؤں کا ہی فائدہ ہے۔“ گامو اُس کی بات پر سر ہلانے لگا تھا۔ ”ٹھیک کہتی ہے تو۔“

”میں سوچتی ہوں بھٹی لگا لوں..... چار پیسے وہاں سے بھی آجائیں گے۔“ اللہ وسائی اب اُن کاموں کے بارے میں سوچنا شروع ہوئی تھی جو کر کے وہ اپنی کمائی بڑھا سکتی تھی۔

”اتنے سال تجھے بھٹی لگانے نہیں دی..... اب لگانے دوں۔“ گامو ملول ہوا۔

”تو کیا ہوا؟..... اولاد کے لئے تو بڑا بڑا کچھ کرتا ہے انسان کا..... یہ تو پھر بھٹی ہے۔“ اللہ وسائی نے ہنس کر کہا تھا۔ اُس کی زبان میں تٹلاہٹ تھی سوچ میں کوئی تٹلاہٹ نہیں تھی۔ وہ موتیا کوز مین کانیں آسمان پر دیکھنا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ہے نابا بابا جان خوبصورت میرا مراد۔“ ننھا مراد پیر ابراہیم کے بستر میں سوراہا تھا اور پیر ابراہیم اُس پر آیات پڑھ کر پھونک رہے تھے جب تاجور نے اُن سے کہا تھا۔ وہ رہنے کے لئے اپنے باپ کے گھر آئی تھی۔

”ماشاء اللہ..... اللہ نظر بد سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔“ پیر ابراہیم نے مسکراتے ہوئے تاجور کو دیکھ کر کہا تھا۔

”بس آپ دعا کریں میرے بھی سات بیٹے ہوں جیسے میرے سات بھائی ہیں۔“ تاجور نے باپ سے اصرار کیا تھا۔

”اللہ عطا کرنے والا ہے۔ اُس کے خزانے میں کہا کمی ہے۔“ پیر ابراہیم نے جواباً کہا تھا۔

”بابا جان ویسے واقعی نصیبوں والی ہوں میں..... پہلے ہی سال اللہ نے بیٹا دے دیا۔ اور اس سال فصل بھی چار گنا ہوئی ہے۔ خوش بختی لائی ہوں میں حویلی کے لئے۔“

پیر ابراہیم نے بیٹی کا پر تفاخر انداز دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔

”بار بار اپنی خوش قسمتی کو نہیں دہراتے تاجور..... سارے انسان قسمت اور نصیب لے کر آتے ہیں۔ بس ہمارے اعمال ہوتے ہیں جو ہمارے آگے آتے ہیں یا پھر آزمائشیں..... اور اللہ تعالیٰ آزمائشوں سے سب کو محفوظ رکھے۔“ وہ کہتے ہوئے تسبیح کرنے لگے تھے۔ تاجور کو اُن کی باتیں اچھی نہیں

”بابا جان میں وہ کہہ رہی ہوں جو جھوک جیون میں سب کی زبان پر ہے۔ جب سے میں وہاں گئی ہوں۔ جھوک جیون کے کھیت لہلہلانے لگے ہیں۔ بارشیں ہونے لگی ہیں۔ ورنہ آپ کو تو پتہ ہے۔ اباجی کیسے ہر سال پریشان آیا کرتے تھے بارش کی دُعا کرواتے۔“ تاجور نے جیسے باپ کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”اللہ نے برکت ڈال دی۔ رحمت بھیج دی جھوک جیون میں..... وہ صرف تمہاری وجہ سے تھوڑی ہوگا۔ پتہ نہیں کتنے نیک لوگ ہوں گے وہاں دُعا میں اور عبادتیں کرنے والے۔ پتہ نہیں کس کی دُعا لگی ہوگی کس کی قبول ہوئی ہوگی۔ تاجور اس بار خفا ہو گئی تھی۔

”ایک تو اباجان آپ ہمیشہ مجھے ہی ٹوکتے ہیں۔“ پیر ابراہیم ہنس پڑے اور انہوں نے کہا۔
 ”اچھا یہ ساری باتیں چھوڑو کیچی کا رشتہ طے کر دیا ہے میں نے۔“ انہوں نے بات بدلی تھی اور تاجور کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ اُس کا بڑا بھائی تھا۔

”بھائی جان کا رشتہ؟ اور مجھ سے پوچھا تک نہیں..... میں نے لڑکی دیکھنے جانا تھا..... میں پسند کرتی پھر ہاں کرتے آپ۔“ پیر ابراہیم اُس کی بات پر سنجیدہ ہو گئے تھے۔

”یہ رواج نہیں ڈالنا میں نے اپنے خاندان میں کہ لڑکیاں دیکھ دیکھ کر پسند یا ناپسند کریں..... خاندان اچھا ہے بس تو اچھی ہے گی ہمارے گھر آ کر بھی۔“ پیر ابراہیم نے جیسے بات ختم کی تھی۔

”بابا جان رنگ روپ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بھائی جان اتنے خوبصورت اونچے لمبے ہیں..... اور آپ بغیر دیکھے کوئی بھی لڑکی لے آئیں گے اُن کے لئے۔“ تاجور کو باپ کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی اور پیر ابراہیم اُس کی بات پر یوں ہنسے تھے جیسے وہ انہیں بچوں کی باتیں لگی تھیں۔

”تاجور تو نے کہاں سے سیکھ لی ہیں یہ ساری باتیں؟..... ماں تیری ولی تھی اور باپ تیرا لوگوں کی خدمت کرنے والا اللہ کا بندہ..... تیرا خیر کس پر چلا گیا ہے؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے تاجور سے کہا تھا۔
 تاجور نے جیسے مزید بُرا منایا تھا۔

”ٹھیک ہے بابا جان آپ کریں جہاں بھی کر رہے ہیں بھائی جان کا رشتہ..... تاجور کو نہ پوچھیں..... پر جب تاجور اپنے بیٹے کا رشتہ کرے گی نا تو چھان چھٹک کر دیکھ بھال کر کرے گی۔ ایسے ہی نیکیاں اور نسب دیکھ کر ہنس کر دے گی۔“ اُس نے جیسے باپ کو سنایا تھا۔

”کیا پتہ مراد کے دل کو کیا بھاجائے پھر تو اُس کے دل کا کیا کرے گی؟“ پیر ابراہیم نے عجیب سے

انداز میں کہتے ہوئے پہلے مراد کو اور پھر تاجور کو نہس کر دیکھا۔

”ماں کے دل سے بڑھ کر کوئی دل نہیں ہوگا اُس کے لئے بابا جان۔“ تاجور نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔ مراد اب ہلتے جلتے ہوئے جمائیاں لینے لگا تھا۔ پیرا براہیم بیٹی کو دیکھتے رہے۔

☆.....☆.....☆

وہ گاؤں کے سکول میں موتیا کا پہلا دن تھا اور گا مو اور اللہ وسائی اُسے خود چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اُس سرکاری سکول میں لڑکوں کے ساتھ جانے والی پہلی لڑکی تھی اور سکول کے پہلے ہی دن اُس کا سامنا مراد سے ہوا تھا۔ جو چوہدری شجاع اور اپنے ملازموں کے ساتھ سکول آیا تھا۔ اُس کا بیگ ایک ملازم نے پکڑا ہوا تھا۔ اُس کے پانی کی بوتل دوسرے نے اور تیسرے نے اُس کی کرسی اور میز جو تاجور نے شہر سے منگوائی تھی کیونکہ گاؤں کے سکول میں ٹاٹ تھے۔ تاجور اور شجاع نہ چاہنے کے باوجود مراد کو گاؤں کے سکول بھیجنے پر مجبور تھے وہاں وہ ایک ہی سکول تھا اور آس پاس کے دیہات میں جو سکول تھے اُن کا حال بھی ویسا ہی تھا۔ وہ اُسے شہر کے کسی بورڈنگ سکول داخل کروانے کا جگر نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ مراد کے بعد تاجور کے ہاں ابھی تک کوئی اور اولاد نہیں ہوئی تھی۔

”ارے گا مو تو کہاں جا رہا ہے؟“ شجاع نے گا مو اور اللہ وسائی کو موتیا کے ساتھ سکول جاتے دیکھ کر جیسے کچھ حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”چوہدری صاحب موتیا کو بھی سکول داخل کروا دیا ہے۔ پڑھائیں گے اسے۔“ گا مونے کہا تھا چوہدری شجاع نے مسکراتے ہوئے بے حد حیرانی سے موتیا کو دیکھا اور جیسے دل ہی دل میں چشم بدور کہا۔ وہ بچی گا مو اور اللہ وسائی کے پاس کھڑی کسی ہیرے کی طرح چمک رہی تھی۔

”چلو یہ تو بڑا اچھا ہے۔ گاؤں میں بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج آئے۔“ چوہدری شجاع نے کہا تھا اور مراد کو اٹھائے ہوئے ملازم کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

پر مراد کی آنکھیں ملازم کی گود میں بھی بس موتیا پر ٹک گئی تھیں جو اُس کے عقب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ آرہی تھی۔

بچپن معصوم ہوتا ہے اسی لئے مومن ہوتا ہے اور حسن پرست بھی۔ ننھا مراد اُس لمحے میں موتیا کے ساتھ دوستی کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اُسے وہ ایسی ہی پیاری لگ گئی تھی۔

”میں نے اُس کے ساتھ بیٹھنا ہے۔“

اُس نے موتیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اندر کلاس میں ضد کی تھی جو ٹاٹ کے ایک سرے پر سب لڑکوں سے الگ بیٹھی ہوئی تھی اور مراد کی کُرسی اور میز ماسٹر کی کُرسی اور میز کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ چوہدری شجاع نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانا تھا اُس کو موتیا کے ساتھ ہی بیٹھنا تھا اور وہ بالا آخر موتیا کے پاس آکر ٹاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ جتنا چہرہ مراد کا کھلا تھا اُس سے زیادہ چمک موتیا کے چہرے پر آئی تھی۔
”دوستی؟“

ایک انگلی کو کندے کی طرح کرتے ہوئے موتیا کی طرف بڑھاتے ہوئے مراد نے اُس سے پوچھا تھا۔ موتیا نے اپنی انگلی کا کندہ اُس کی انگلی میں ڈالتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ مراد نے اپنی بوتل کو موتیا کے منہ کے ساتھ لگا دیا تھا۔ موتیا نے جھجکتے ہوئے پہلی بار حویلی کا وہ پانی پیا تھا جو اُس کا باپ گا موہی وہاں پہنچا کر آتا تھا۔

وہاں کھڑے گا مو، اللہ وسائی، چوہدری شجاع اور اُس کے ملازم ہونٹوں پر مسکراہٹیں لئے ہوئے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ بچوں کی دُنیا تھی اور اُس میں بس باغ ہی باغ ہوتے ہیں۔
ماسٹر صاحب نے پڑھانا شروع کیا تھا۔

پڑھو الف سے اللہ

جو سب کا ہے

الف سے اللہ

جو سب کا ہے

موتیا اور مراد بھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پہلا سبق پڑھ رہے تھے۔ موتیا مراد کو پہلے ہی دن زمین پر لے آئی تھی۔

☆.....☆.....☆